چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر
رضاء الجبار

"زبان وبیان کے معاملے میں بھی رضا الجبار بے حد محتاط واقع ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں وہ افراط، مبالغہ اور طولانی کے قائل نہیں۔ زبان سادہ اور صحیح ہوتی ہے۔ فقرے چست اور چھوٹے، مسلسل ندی کی طرح رواں لیکن پاٹ چوڑا نہیں۔ منضبط اور مربوط نثر لکھتے ہیں جو کہانی کے ساتھ گویا چپکی ہوئی اور منڈھی ہوئی آخر تک چلی جاتی ہے۔ کہیں پر جھول، بے محل افکار یا فالتو گفتگو کا احساس نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں یہ ان کے افسانوں کی بہت بڑی خوبی ہے۔ اس رواں دواں ندی کے بیچ میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے خوبصورت جزیرے بھی نظر آتے ہیں۔ جو قاری کی نگاہ میں نگینوں کی طرح چمک جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

"آپ کسان کی طرح جھومئے میں فصل کی طرح لہراؤں گی۔"

"آسمان پر چاند تیر رہا تھا اور جھیل میں کشتی۔ کوئی فرق اگر تھا تو یہ کہ چاند میں داغ تھا اور کشتی میں میں۔"

"—— بھابھی! میں آپ کو بچانے کے لئے ڈوب سکتا ہوں۔ آپ کو لے کر ڈوبنا تو بہت دور کی بات رہی۔"

کرشن چندر

چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر

چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر

رضاءُالجبّار

کتاب : چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر (افسانے)
مصنّف : رضاء الجبّار
اشاعت: ۱۹۹۳ء
تزئین و ترتیب : ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
سرورق : سعود عالم
کتابت: سیّد ابوجعفر زیدی
مطبع : نیو پبلک پریس، دہلی
تعداد : ۶۰۰ (چھ سو)
قیمت : ۸۰ روپے / ۱۰ ڈالر
ناشر : نیا سفر پبلی کیشنز
سی-۱۶۶- وِویک وہار۔ دہلی ۹۵-۱۱۰۰

CHAND KI KASHTI KA AKAILA MUSAFIR
(Short Stories)
By
RAZAUL JABBAR
3311 KINGSTON ROAD, SUITE NO, 901
SCARBOROUGH, ONTARIO
M1M 1R1 Canada

Rs. 80/-
10 dollar
Edition : 1993

NAYA SAFAR PUBLICATIONS
C-166, VIVEK VIHAR
DELHI-95

ترتیب

اِنتِساب

نارتھ امریکہ کے حکومتوں کی پالیسی ملٹی کلچر کی حامی ضرور ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سرزمین پر مغربی تہذیب کی تیز اور تند ہوائیں چلتی ہیں جو اتنی طاقت ور ہیں کہ مشرقی ممالک سے لائی ہوئی اقلیت کی تہذیب و تمدّن کو اُڑا لے جاسکتی ہیں۔

ایسی فضا میں جب، ہماری نسل کے نئے پودے، زمین میں اپنی جڑوں کو مضبوط کر لینے کے بعد، اپنے والدین کی لائی ہوئی قدروں کو اپنا کر آگے بڑھنے کی تگ و دو کر رہے ہیں؛ ہمیں بڑی خوشی اور طمانیت ہوتی ہے۔

اس لیے یہ کتاب اپنے عزیز اور سعید بچّوں

رضوان، شحنہ اور جاوید

کے نام

معنون کرتا ہوں

پیش لفظ

ڈاکٹر قمر رئیس

گزشتہ ربع صدی کے عرصے میں، جب برِ صغیر میں علامتی، تجریدی اور حقیقت پسندانہ افسانے کی طول طویل بحثیں چھڑی ہوئی تھیں، مغرب میں بسنے والے اُردو کے افسانہ نگار، ان بحثوں سے بے نیاز، پورے تخلیقی انہماک سے افسانے لکھ رہے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ان مباحث سے یا ادب کے دوسرے نزاعی سوالوں سے واقف نہ ہوں۔ خود مغرب میں اس نوع کے سوالوں پر معرکے کی بحثیں ہو رہی تھیں یقیناً وہ ان سے بھی بیگانہ نہیں ہوں گے، لیکن خود ان کا ترجیحی مسئلہ، یہ مسائل نہیں بلکہ تخلیق کے محرکات اور منصب سے عہدہ برا ہونا تھا۔ خواہ اس کے لیے وہ حقیقت پسندانہ طریقِ کار اختیار کریں یا علامت اور استعارہ کا سہارا لیں۔ اساطیری کردار لائیں یا الف لیلوی فضا تخلیق کریں۔ فطرت کے البیلے مظاہر سے کہانی کو مربوط کریں یا ٹکنیک میں نئی تدبیروں سے حُسن اور دلچسپی پیدا کریں —— انھیں ایک تخلیق کار کی حیثیت سے اس کی مکمل آزادی حاصل تھی اور اس آزادی کا استعمال انھوں نے اپنے افسانوں میں پوری ذمّہ داری اور اعتماد سے کیا —— یہ بات دیارِ مغرب

کے ممتاز اُردو افسانہ نگاروں کے حوالے سے، وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ رضاء الجبار بھی ایک ایسے ہی تخلیق کار ہیں۔

جو لوگ ان سے ملے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی زندگی ایک حوصلہ خیز رزمیہ حکایت سے کم نہیں۔ اپنے بے مثل عزم و استقامت سے انھوں نے جسمانی معذوری پر فتح پائی اور اپنی مسلسل جانفشانی سے اپنے پیشے میں امتیازی کامیابیاں حاصل کیں۔ حالانکہ اکاؤنٹ اور آڈیٹنگ کے جس پیشے سے وہ وابستہ ہیں وہ ان کے ادبی اور تخلیقی مزاج سے شاید مناسبت نہیں رکھتا ہے۔ اس لیے کہ وہاں تو ہمیشہ دو اور دو چار ہوتے ہیں جبکہ یہاں معاملہ اکثر برعکس ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پیشے کی مصروفیت ان کی تخلیقی سرگرمیوں میں حارج ہوئی ہو۔ لیکن اس میدان میں بھی اپنی پیہم کاوشوں اور لگن سے انھوں نے ایک ایسا معیار اور اعتبار حاصل کر لیا جس پر وہ فخر کر سکتے ہیں۔

رضاء الجبار کے منتخب افسانوں کا یہ مجموعہ ایک ایسا جھروکہ ہے جس کے اندر نظر دوڑایئے تو ان کے خوابوں، دردمندانہ رشتوں، آدرشوں، محرومیوں اور حیران کن حقیقتوں کے ان گنت منظر —— ساکت اور متحرک منظر، بکھرے ہوئے نظر آئیں گے —— ہر منظر کا اپنا تناظر ہے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے سے مختلف بھی لگیں گے۔ لیکن جس تخلیقی احساس کی آنچ نے ان کو ایک پیکر دیا ہے۔ زندگی کے جس وژن نے ان کو جلا بخشی ہے وہ ضرور مشترک لگے گا۔

ان افسانوں کا پہلا وصف جس نے مجھے متوجہ کیا وہ بیانیہ کی سادگی سے زیادہ اس کی قوت اور اثر انگیزی ہے جو پورے افسانے کو معنوی وحدت دیتی ہے اور قاری کو ایک پل کے لیے بھی افسانے کی فضا سے نکلنے نہیں دیتی۔ اس بیانیہ کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ افسانے میں بعض اشیا اور فطرت کے مظاہر خاموش انداز سے علامتی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور معنوی حسن کا دائرہ پھیلنے لگتا ہے۔ اس طرح کہ کبھی کبھی اس میں سحر کار سرّیت پیدا ہو جاتی ہے۔ صرف ایک

مثال لیجیے۔ 'شگاف' کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"یادوں کے گھاؤ اور خوابوں کا لہو لیے ایک بن کھلی، مرجھائی ہوئی اُداس کلی، آہستہ آہستہ اُس چٹان کی طرف جانے لگی۔ ڈرتا ہوا چاند دُور کی پہاڑیوں کے اوپر سے کھنڈالہ کی بھیانک پُر شگاف گھاٹیوں کو جھانکنے لگا۔ پھر ذرا بے خوف ہو کر اوپر آیا تو غور سے دیکھا۔ وہی چھوٹا سا میدان تھا جس کے تین طرف مہیب پہاڑیاں تھیں۔ چٹان ویسی ہی تھی۔ ہریالی ویسی ہی تھی۔ چٹان سے چند گز کے فاصلے پر ایک جنگلی پھول کا پودا ابھی جوں کا توں تھا۔ چاندنی سُلگ سُلگ کر گر رہی تھی۔ پہاڑیاں چمک رہی تھیں۔ پریتی آہستہ آہستہ چٹان کی طرف بڑھنے لگی......"

یہ ساکت اور اُداس منظر ایک باکمال مصوّر کی پینٹنگ سے مشابہ ہے۔ جہاں ہر لفظ، ہر فقرہ، رنگوں کی طرح پُرکار ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر سراغ ملتا ہے یہ منظر اس المیہ اور پراسرار کہانی کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی اور اس کا مرکزی نقطہ بھی۔ یہ محبت کی کہانی ہے۔ لیکن کیا یہ صرف محبت کی کہانی ہے؟ پریتی کا نسوانی پیکر، چاندنی، ہریالی، ہوا کا نرم جھونکا، جنگلی پھول اور خوشبو جو ہر بیل اور ہر پردیپ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور پھر اچانک وقت کے بھیانک شگاف میں گر کر ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ بے کراں حسن سے معمور اس کائنات میں انسان کے ازلی سفر کی داستان نہیں ہے؟ کیا یہ مہربان اور سفاک فطرت سے انسان کی آنکھ مچولی، وصل اور جدائی کا قصہ نہیں ہے؟ کہانی کی قرأت اس طرح کی کئی معنوی لہریں ذہن میں جگاتی ہیں اور نئی جمالیاتی کیفیت سے قاری کو ہمکنار کرتی ہے۔

یہی معنوی تہ داری 'کھلا ہوا دروازہ'، 'کوے'، اور 'وٹامن کی گولیاں' جیسی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ 'کھلا ہوا دروازہ' مغربی سماج کے بہت سے کھوکھلے دعووں کو برہنہ کر دیتی ہے۔ جانوروں سے ان کی نام نہاد ہمدردی،

انسانی حقوق کے تحفظ کا پُرفریب دعویٰ، انسانی مساوات کے نعرے۔ افسانہ نگار نے ٹامی اور ٹائیگر کی کہانی اس سلیقے سے سنائی ہے کہ بغیر پروپیگنڈہ کیے وہ ان سارے نمایشی دعووں کی قلعی کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اپنے مجموعی تاثر میں یہ کہانی رنگ و نسل کی ظالمانہ تفریق کے خلاف احتجاج اور شدید احتجاج کی کہانی ہے۔ رامو جب اپنے دوست ٹائیگر پر ظلم ہوتا دیکھتا ہے تو افسانہ نگار اس کی قلب ماہیت کو یوں دکھاتا ہے۔

"اب رامو دوڑ رہا ہے۔ اس پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا منہ کھل گیا۔ اس کے نکیلے دانت نظر آ رہے ہیں۔ وہ کاٹے گا اُس آدمی کو جس نے ٹائیگر پر پتھر اُٹھائے تھے۔ اُس کی دوڑ میں اب شدّت کی تیزی آ رہی ہے۔ دوڑ رہا ہے۔ وہ تیز دوڑ رہا ہے۔"

"کوے" ایسی کہانی ہے جس کے رموز و علائم قاری کو اس عہد کی بنیادی سچائیوں کے روبرو کھڑا کر دیتے ہیں۔ عوام دوستی، عام انسانوں کے اقتدار اور ان کی آزادی کا جذبہ ہی اس کہانی کی جان ہے۔ یہ اقتدار (ESTABLISHMENT) سے وفاداری اور بغاوت کی کہانی ہے۔ جسے افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے تراشا ہے۔

دیارِ مغرب کی زندگی میں رضا الجبّار جن تلخ اور اذیت ناک تجربات سے دوچار ہوئے ان میں سفید فام لوگوں کا ایفرو ایشیائی نسل کے انسانوں کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک ہے۔ ایک دوسری کہانی "پُرانا زنگ" میں بھی وہ اسی تذلیل کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔

برک جب سنتا ہے کہ کتّے نے اپنے سفید فام مالک کے رویّے کے خلاف احتجاج کیا ہے تو:۔

"اچانک برک کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس کے ہاتھ بھنچ گئے۔ اس کے ابروؤں میں خم، آنکھوں میں چمک آگئی اور وہ بولا۔

"اِس کتّے کا رنگ کالا ہے سر!"

اس بے زبان نے بہت سے زبان والوں کے خلاف دوڑ لگا رکھی ہے۔ انعام بھی لیا... غلامی کے خلاف شکایت کرنے والے اس کتّے کا نام لوبو ہے سر۔ لوبو۔ سر۔"

تکنیک اور ذہنی رویّے کے اعتبار سے رضاء الجبّار کی ان کہانیوں میں صرف تازگی ہی نہیں، تنوع کا احساس بھی ہے۔ وہ روایت سے استفادہ کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اپنے بیانیہ کو وہ رمز و ایما، تمثیل اور طنز کے پیرایے سے بھی سجاتے ہیں۔ کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کے یہاں سیاسی طنز کی بڑی خوبصورت کہانیاں ملتی ہیں۔ رضاء الجبّار کا سیاسی شعور بھی ان کے تخیل کو مہمیز کرتا ہے اور وہ 'داداجان کی وصیّت' جیسی تمثیلی کہانی لکھتے ہیں۔ منٹو نے بھی چچا سام کے نام اپنے خطوں میں امریکی سامراج کی رعونت، سیاسی ریشہ دوانیوں، استحصالی سازشوں اور ساری دنیا پر اقتدار جمانے کی ہوس کو برہنہ کر کے دکھایا ہے۔ رضاء الجبّار نے عالمی بساط پر اس طاقت کی نئی حکمت عملیوں اور آمرانہ سازشوں کے راز فاش کیے ہیں۔

"گدھے کی پیٹھ پر پری کا ناچ" بھی طنز یہ افسانہ ہے۔

پرانی دنیا کا ایک گدھا میڈیا کے سہارے سستی شہرت کماتا اور شاعروں کو عیش و طرب سے معمور نئی دنیا، میں لے جانے کے خواب دکھاتا ہے لیکن جب نئی دنیا میں جاتا ہے تو شہرت، پنکھ لگا کر اڑ چکی ہے۔ اب وہ دوسرے شعرا کے سروں پر تاج رکھتی ہے اور وہ گدھا ہی رہ جاتا ہے۔ اس کہانی کا تاثر دوسرے افسانوں سے مختلف ہے لیکن اس کے طنز کی زد پر کون ہیں؟ یہ جاننا مشکل نہیں ہوتا۔"

چند کہانیاں جو اپنے فنی توازن اور تکمیل کے اعتبار سے اس مجموعے کی نمائندہ کہانیاں کہی جا سکتی ہیں اور جو افسانہ نگار کی تخلیقیت اور باطنی کشمکش کے کئی پہلو

سامنے لاتی ہیں، 'وٹامن کی گولیاں'، 'چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر'، 'ایک ہنسی بے نکی سی' اور "چراغ تلے" ہیں۔ کم از کم میرے ذہن میں یہ کہانیاں ایک دیرپا بلکہ دائمی نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ اوّل الذکر کہانی میں جارجیٹا کے دلچسپ کردار کی تہیں بڑے ڈرامائی انداز سے کھلتی ہیں۔ اس بوڑھی لیکن صحت مند عورت سے کہانی کے واحد متکلم کو اس وقت تک کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جب تک وہ ایک وٹامن بنانے والی کمپنی کا ایجنٹ نہیں ہو جاتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اس بوڑھی عورت کو سیلبرٹی کا ماڈل بنائے۔ اب اس کی ذات میں، اس کی صحت کا راز جاننے میں وہ پوری دلچسپی لیتا ہے۔ گویا اس سماج میں تمام انسانی رشتے پگھل کر صارفی اور کاروباری رشتوں میں بدل چکے ہیں۔ آخر میں اس کی صحت کا راز یہ کھلتا ہے کہ وہ قدرت کے قوانین کی پابندی کرتی ہے اور گھر کے تین پالتو کتوں اور پانچ بلّیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ کاروباری اور مصنوعی زندگی گزارنے والے اس سماج میں یہ انجام بہت رمزیہ (IRONICAL) ہو جاتا ہے۔

'چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر'، معذور انسانوں کی المیہ زندگی کے بارے میں ایک موثر کہانی ہے۔ ان کا درد، ان کی محرومی، ان کی بدنصیبی قاری کی حیثیت میں دور تک جگہ بنا لیتی ہے۔ مہیش کے کردار میں خود افسانہ نگار کی بیتی ہوئی زندگی کا کرب جھلکتا ہے۔

آخر الذکر دونوں کہانیوں میں مشرق اور مغرب کے امتزاج اور آویزش کو افسانہ نگار نے دو مختلف دائروں میں دکھایا ہے۔

شمالی امریکہ میں رہنے والی صابرہ جب اپنی سفید فام دوست روزمیری کو بتاتی ہے کہ وہ اپنے والدین کی ایما اور رواج کے مطابق ARRANGED شادی کرے گی تو اس بات پر روزمیری ایک طنزیہ قہقہہ لگاتی ہے جس کا ڈنک صابرہ محسوس کرتی ہے۔ میری آزاد جنسی رشتوں اور محبت کی شادی

میں یقین رکھتی ہے۔ لیکن اس کے سارے عشق اور شادیاں ناکام ہو جاتے ہیں۔ بیس سال بعد وہ بالکل تنہا، اداس اور بے سہارا ہوتی ہے۔ دوسری طرف افسانہ نگار بتاتا ہے کہ صابرہ کی شادی کامیاب ہوتی ہے اور وہ اپنی جوان بیٹی زاہدہ کی شادی بھی ARRANGED ڈھنگ سے کرتی ہے تو روز میری کو بھی مدعو کرتی ہے۔ شادی کا کارڈ دیکھ کر وہ پھر ایک زوردار قہقہہ لگاتی ہے لیکن اب اس میں طنز اور تمسخر کا پہلو نہیں تھا۔ اس کی شکست خوردگی تھی۔ وہ صابرہ سے کہتی ہے کاش وہ بھی ترکِ وطن کر کے ہندوستان سے کناڈا آئی ہوتی اور ان ہی قدروں کو سینے سے لگائے ہوتی جو سکون و راحت اور روحانی آسودگی کی ضمانت ہوتی ہیں۔ اگرچہ کہانی میں صابرہ کا کردار غیر فطری حد تک اکہرا اور سطحی ہے لیکن مجموعی طور پر کہانی میں جس تہذیبی تضاد کو ابھارا گیا ہے وہ متاثر کرتا ہے۔

صابرہ کے کردار کا دوسرا رخ پیش امام کی بیٹی کے کردار میں نظر آتا ہے وہ اپنے باپ کی مذہبی برگزیدگی کا احترام کرنے کے باوجود اپنی ایک علیحدہ اور آزاد دنیا رکھتی ہے۔ اس کی آنکھیں شمالی امریکہ کی تجارتی اور اشتہاری چمک سے چکاچوند ہو جاتی ہیں اور وہ آسانی سے اس کی ترغیبات کا شکار ہو جاتی ہے۔ پیش امام سچ کہتا ہے کہ اس کی بیٹی کی آنکھوں کے آگے 'نئی دنیا' کا اندھیرا آگیا ہے۔ صابرہ اور پیش امام کی بیٹی کے کرداروں کا یہ تضاد حقیقت پسندانہ اس لیے ہے کہ صابرہ کی پیدائش اور تربیت حیدرآباد دکن کے ماحول میں ہوئی ہے اور موخرالذکر کی پیرس کی آزاد فضاؤں میں۔ دونوں دو مختلف نظام اقدار کی نمائندگی کرتی ہیں۔

رضاء الجبّار کے ان افسانوں میں احساس کی توانائی کے ساتھ ساتھ ایک سوچتا ہوا ذہن بھی ہے۔ مغربی تہذیب سے ان کی بیزاری کا سبب یہ ہے کہ وہ مشرق کی اعلیٰ انسانی قدروں سے جڑے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی

سچائیوں کو، نئی اور پرانی دنیا کے آشوب کو اپنے وجود میں شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن ان کے تخلیقی اظہار کے عمل میں وہ کئی انجانی سچائیوں کو بھی دریافت کرتے ہیں جو ان کی شاہکار کہانیوں کے تار و پود کو مضبوط اور معتبر بناتی ہیں اور اپنے معاصرین میں انھیں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔

رضاء الجبّار

اُردو افسانے کا ایک روشن مینارہ

عبد القوی ضیاء

کہانی کا جنم دن وہی ہے جو انسانی زندگی کا۔

کہانی کی ابتدا، اس وقت ہوئی جب پہلے انسان نے اپنی بہت سی خواہشات، توقعات اور محسوسات کا اظہار پتھروں، چٹانوں، غاروں، کھووں، درختوں پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچ کر اور بہت سے نقش و نگار بنا کر کیا۔ رسم الخط کے ایجاد ہونے کے بعد ان اَن کہی اور اَن سُنی کہانیوں کا اظہار حروف و الفاظ کے ذریعے ہونے لگا۔ یوں کہانی سوچنے کے عمل نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر انسان دوستی کا گہرا ثبوت دیا اور خود کہانی انسان کی سب سے قدیم مگر دوامی ساتھی بن بیٹھی۔

رفتہ رفتہ ان کہانیوں نے اور بہت سے روپ دھار ہے۔ قصہ گوئی، سوانح حیات، واقعاتِ جنگ و جدل، بیانِ فتح و شکست، حکایاتِ حکمرانی و کامرانی۔ یہ سب اس کی زیبِ داستاں بنیں۔ جیسے جیسے انسان حقائقِ زندگی سے قریب آتا چلا گیا، کہانی کے موضوعات اور مطالبات بھی بدلتے گئے۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ انسان کے اپنے دکھ درد، ذاتی کشمکش، معاشرتی، معاشی

اور سیاسی مسائل، ماحول کی پراگندگی، حالات کی ابتری، طبقاتی اونچ نیچ، تہذیبی انتشار، سماجی خلفشار اور اسی نوعیت کے نہ جانے کتنے ہی موضوعات کہانی کے اجزاء بن گئے پھر ان میں فکر و نظر کی رعنائیاں، رومان انگیز رنگینیاں بھی شامل ہونے لگیں۔ مشاہدہ، مطالعہ اور تجربہ کی کارفرمائیاں بھی نظر آنے لگیں۔ یوں کہانی نے افسانہ نگاری کا جامہ زیب تن کر لیا اور وہ انسانی زندگی کے مسائل، مصائب اور معاملات کی ترجمان بن بیٹھی۔

اُردو میں افسانہ نگاری کا نقشِ اوّل داستان گوئی کی شکل میں نمودار ہوا۔ فسانۂ آزاد خود ایک سلسلہ در سلسلہ طویل داستان ہے اور ایسی نہ جانے کتنی ہی داستانیں اُردو کے دامن میں بکھری ہوئی ہیں جو افسانہ نگاری کی قدامت اور حرمت کا یقین دلاتی ہیں۔ حقیقت نگاری اور رُمان انگیزی کے اعتبار سے غالباً علی محمد شکیل، سید محمود علی اوّلین دور کے افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ ان کی نگارشات اس صدی کی پہلی دہائی میں منظر عام پر آئیں۔ اس کے بعد ترجمہ نگاری کا دور شروع ہوا۔ انگریزی، فرانسیسی اور دوسری مغربی زبانوں کے بہت سے افسانے بڑے فن کارانہ انداز میں اُردو میں منتقل کیے گئے۔ یہ کام بڑے سلیقے سے سجاد حیدر یلدرم، حامد اللہ افسر، چودھری محمد علی ردولوی اور دوسرے حضرات کے ہاتھوں انجام پایا۔ لیکن جس فنکار کے ہاتھوں حقیقتاً افسانہ نگاری کی بنیاد پڑی وہ پریم چند تھے۔ آج ہمارے سامنے افسانے کی جو ہیئت، شکل، مزاج اور صورت ہے، اس کی تشکیل و تعمیر میں اس رجحان ساز افسانہ نگار کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس صنف میں ان کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھانے میں اعظم کریوی، علی عباس حسینی، چودھری محمد علی، راجندر سنگھ بیدی، سدرشن، کرشن چندر کے نام آتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ان راہوں پر سفر کیا جس کی تعمیر پریم چند کے ہاتھوں ہوئی تھی بلکہ افسانہ نگاری کی روایت کو حقیقت شناسی، حقائق پسندی اور زندگی کے گوناگوں تجربات اور واقعات سے

قریب لانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اسی زمانے میں نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، اختر اورینوی، لطیف الدین احمد، محمد حسن عسکری وغیرہم نے بھی اُردو افسانے کو رومان انگیزی، تخئیل پسندی اور انسانی جذبات وافکار سے روشناس کرایا۔ داستان کی روایت کو اپنے افسانوں میں سمو کر اس کے افق کو اور بھی تابندہ کر دیا۔ لگ بھگ اسی دوران افسانے کو زندگی کے حقائق سے قریب تر لانے، عصری شعور سے نکھارنے، سنوارنے، موضوعات، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے نئے نئے امکانات پیدا کرنے کا رول ترقی پسند تحریک نے بڑے مثبت انداز میں ادا کیا۔ اس کے اثرات سجّاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، غلام عباس، راجندر سنگھ بیدی، عظیم بیگ چغتائی اور بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتے ہیں۔ رشید جہاں، احمد علی، سجاد ظہیر نے نئے سماجی اور سیاسی حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جنسی ناہمواریوں کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ احمد علی اور رشید جہاں وغیرہ نے اس کی بنیاد رکھی اور ان کی تخلیقات 'انگارے' اور 'ہماری گلی' خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس صنف میں بڑے نئے نئے تجربے کیے۔ بھوک، افلاس، فاقہ، تنگدستی، انسانی استحصال، جنس پرستی، انسان دوستی کو بھی افسانوں کا محبوب موضوع بنا دیا۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاتھوں اُردو افسانہ کی سطح اتنی بلند ہو گئی کہ وہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں بڑے وقار کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں آزادی سے کچھ عرصہ قبل اور مابعد ہر شعبۂ حیات میں قابلِ ذکر تبدیلیاں آئیں جس کی وجہ سے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ خاص طور پر اُردو افسانوں میں لیا جانے لگا۔ انسانوں کے درمیان نئے نئے رابطوں، ملکی اور بین المملکتی مسائل نے افسانے کو بہت متنوع بنا دیا۔ شروع شروع میں انقلابی حالات اور فسادات اُردو افسانہ کا مرغوب موضوع بنے رہے۔ پھر

انسانیت پرستی، نفسیاتی خلش، تحلیل نفسی، زندگی میں رونما ہونے والے بہت سے حادثات اور سماجی تصادم کی تہ داریاں بھی اس کا حصہ بن گئیں۔ نئی نسل کے افسانہ نگار اپنے افسانوی ادب کو عصری آگہی سے باخبر رکھنے کی ذمہ داری کو سنبھالنے میں پوری دلچسپی لیتے رہے۔ یوں ہمارا افسانہ تخلیقی اعتبار سے کئی خانوں میں بٹ گیا۔ اس دور میں عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، حیات اللہ انصاری، شوکت صدیقی، ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، کنھیا لال کپور، انتظار حسین، رام لال، جوگندر پال، حسن منظر، شکیلہ رفیق، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، عابد سہیل، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، اے۔ حمید، ممتاز مفتی، مسیح الحسن رضوی، فرخندہ لودھی، عمر میمن، غلام الثقلین نقوی[1] اور دوسرے بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنی ذہانت اور دانشوری کے بل بوتے پر اردو افسانہ کو اور بھی متنوع اور ہمہ گیر بنا دیا۔ اسی نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم اور قابلِ اعتنا نام رضاء الجبار کا بھی ہے۔ جن کے ہاتھوں افسانہ نگاری کے فن کو اور بھی چار چاند لگ گئے۔

رضاء الجبار جیسے محنت کش، اولوالعزم اور بلند حوصلہ انسان میں نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ وہ بیساکھی کے سہارے جو معرکہ سَر کر لیتے ہیں اور بہت سے امور انجام دے لیتے ہیں وہ اگر مجھ جیسے شخص کو چار ہاتھ پیر بھی مل جائیں تو نہیں کر سکتا۔ اخلاص، اخلاق، کم آمیزی، دور رسی، دور اندیشی ان کی سرشت کے بنیادی اوصاف ہیں۔ وہ خودنمائی سے پرہیز اور خود ستائی سے گریز کرتے ہیں۔ نہ پہلے وہ کسی خود فریبی اور خود پرستی کے عذاب میں مبتلا تھے، نہ آج ہیں۔ وہ دوسروں کی باتیں سُننا پسند کرتے ہیں، اپنے بارے میں کم

---

[1] یہاں مقصد نام گنوانا نہیں ہے۔ معروف افسانہ نگاروں کی تعداد ہند و پاک میں خاصی زیادہ ہے۔ سب کے نام یہاں بیان نہیں کیے جا سکتے۔

گفتگو کرتے ہیں۔ ادبی موضوعات پر بحث و تمحیص ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہے۔

میں رضاء الجبّار سے جب بھی ملا، مجھے یہ محسوس ہوا جیسے وہ خود کسی افسانے کا جیتا جاگتا کردار ہیں (میں نے جب ان کا افسانہ "چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر" پڑھا تو مجھے خوشی ہوئی کہ میرا یہ قیاس صحیح نکلا) ان کے اندر جو گہرائی ہے اس کی تھاہ پانا آسان نہیں۔ میں نے ان کو اکثر دیکھا ہے کہ محفل میں بیٹھے بیٹھے وہ اس طرح کھو گئے ہیں کہ اغیار لاکھ کوشش کریں پھر بھی نہ پا سکیں۔ ان کی کہانیوں میں وہی خلوص و محبت ہے جو ان کی شخصیت میں ہے۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے مظہر ہیں۔ وہ خود سادہ مزاج ہیں اس لیے ان کا اسلوب بھی سادگی لیے ہوئے ہے۔ اس میں، نہ پیچیدگی ہے نہ ابہام۔

رضاء الجبّار ابھی کمسن ہی تھے کہ پولیو جیسے موذی مرض نے ان کی طاقتِ نقل و حرکت تو چھین لی مگر ان میں احساسِ بے چارگی، بے بسی اور کم ہمتی نہ پیدا کر پائی۔ ان کے عزائم نہ شکستہ پا ہوئے اور نہ ہی ان کے حوصلے پسپا۔ میں نے نہ جانے کتنی ہی ادبی محفلوں میں ان کو پہیئے والی گاڑی کو جوانمردی سے ڈھکیلتے ہوئے دیکھا ہے مگر نہ کبھی وہ ہراساں نظر آئے اور نہ پژمردہ۔ ہر محفل میں اپنی کم سخنی کے باوجود اپنی رائے کے اظہار کرنے میں تامّل نہیں کرتے۔ ان کے مُنہ سے جو بات نکلتی وہ وزن رکھتی ہے۔ ختمِ محفل پر میں نے دیکھا کہ وہ اپنی کار میں جو مخصوص طرز پر ان کی ضروریات کے مطابق بنائی جاتی ہے اس پہیئے والی گاڑی کو توڑ مروڑ کر اپنے برابر کی سیٹ پر رکھ لیتے ہیں اور پھر خود گاڑی اس طرح چلاتے ہیں کہ کیا کوئی دوسرا چلائے گا۔

رضاء الجبار نے اپنے تعلیمی مدارج بڑی تیزی اور مستعدی سے طے کیے۔ وہ متعدد ڈگریوں کے مالک ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں انھوں نے چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کا امتحان پاس کر کے اکاؤنٹینسی ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ کچھ عرصہ بمبئی کی ایک جہاز راں کمپنی

میں اکاؤنٹس آفیسر رہے۔ ساتھ ہی ساتھ برہانی کالج آف کامرس میں جزوقتی طور پر درس وتدریس بھی کرتے رہے۔ ۱۹۸۱ء میں انھیں جانے کیا سوجھی کہ ترکِ سکونت کر کینیڈا کا امیگریشن لے کر ٹورنٹو میں مستقل رہائش اختیار کر بیٹھے۔ جہاں کچھ عرصہ وہ اِدھر اُدھر مختلف دفاتر میں کام کرتے رہے۔ پھر اپنی ذاتی اکاؤنٹینسی کی فرم کھول لی۔ چھ سال قبل حکومت کینڈا کی ملازمت حاصل کرلی۔ اب انکم ٹیکس آفیسر کے طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور بہت مطمئن نظر آتے ہیں۔

ان کے ادبی سفر کا آغاز ایک کہانی "لڑکیوں کا وارڈ" سے ہوا۔ یہ ایک طالب علم کی معصومانہ کوشش اور اس کی پہلی ادبی کاوش تھی جو آگے چل کر اس کی شناخت کا سبب بنی۔ یہ 'رہبر' بمبئی میں شائع ہوئی اور لائقِ انعام سمجھی گئی اس کے ترجمے ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی ہوئے۔ جب وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علم ہوئے تو شعبۂ اُردو سے نکلنے والے مجلّہ کی ادارت انھیں سونپی گئی اس دوران ان کی کئی کہانیوں نے مقابلوں میں انعامات جیتے۔ ان کی بعض کہانیوں کو سال کی بہترین نگارشات میں شمار کیا گیا۔ ان کے اندر جو ایک بہت ہی اچھا افسانہ نگار چھپا ہوا تھا وہ اب ابھر کر سامنے آگیا۔ وہ مستقل افسانے لکھتے گئے جو معیاری اور معتبر جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "روشنی کی کرن" ۱۹۷۱ء میں شائع ہو کر مہاراشٹر حکومت کی طرف سے لائقِ ایوارڈ سمجھا گیا۔ حکومتِ ہند کی جانب سے اس کے ہندی اڈیشن پر انعام دیا گیا۔ بچّوں کے لیے جو افسانچے لکھے وہ "نو ہیرے" کے عنوان سے چھپے اور بچّوں کی دل بستگی کا سامان بنے۔ "حدیثِ دل" دکن پر لکھی ہوئی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ بھی شائع ہوا۔ ٹورنٹو سے "رنگ برنگ کے پھول" نام سے بیرونی اور مقامی شعرا کا انتخاب کلام بھی شائع کیا۔ فی الوقت ان کے دو افسانوں کے مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔

ان کے جو افسانے اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کو برصغیر پاک و ہند کے علاوہ شمالی امریکہ کے سیاسی اور سماجی، ثقافتی اور معاشی عوامل اور محرّکات کا بھی پوری طرح اندازہ ہے۔ ان کا فنّی شعور صرف واقعات یا ظاہری حالات کے مشاہدے تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی تہہ میں غوطہ زنی کر کے وہ آبدار موتی نکال کر لاتا ہے جو دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ وہ کسی واقعہ کو محض احساساتی اور جذباتی پیمانے سے ناپنے کے بجائے اس کو پوری طرح سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جنوبی ایشیا سے مراجعت کر کے جو لوگ شمالی امریکہ میں آبسے ہیں پہلے تو وہ کلچرل شاک کا شکار ہوئے ہیں پھر معاشی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ پھر بہت سی محرومیوں، بے انصافیوں اور ناامیدیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجتاً وہ بہت سی الجھنوں اور دماغی کلفتوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ترکِ مکانی خود ایک دشوار گزار مرحلہ ہے جس کو طے کرنا آسان نہیں۔ اس راہگزر میں جو مشکلات ہیں، افراط و تفریط کے ساتھ سبھی کو ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رضاء الجبار نے انھیں مہاجرین کے مصائب اور مسائل کو اپنے افسانوں کا تھیم بنایا مگر ان کا اظہار کھردرے پن، تلخی، طنز و تمسخر یا اکتاہٹ کے ساتھ کرنے کے بجائے نرمی، ملائمت، دھیمے پن سے کیا۔ ان کا قلم صاف گوئی کا عادی ہے مگر یاوہ گوئی کا نہیں۔ ان کی تکنیک کبھی بیانیہ ہوتی ہے کبھی رمزیہ، کبھی علامتی مگر ان کا لہجہ ہمیشہ متوازن، متناسب اور منطقی ہوتا ہے۔ بیان کی فضا میں بکھرے ہوئے بہت سے کردار بڑی بیباختگی اور بیباکی کے ساتھ ان کے افسانوں میں در آتے ہیں اور پھر جیسے جیسے کہانی بڑھتی جاتی ہے وہ کردار بڑے جاندار اور گمبھیر ہوتے جاتے ہیں اور قاری کو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ افسانوی نہیں بلکہ حقیقی کردار ہیں۔ ان سے متعلق تلخ و ترش حقائق یا نقائص کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو تلخی کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ ان کے بیشتر افسانوں میں زندگی اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ

رواں دواں، جلوہ ساماں اور حشر بداماں نظر آتی ہے۔ روزمرہ کی حقیقتوں اور معاشرے کی نزاکتوں کو اس طرح واضح کرتی ہے جیسے کوئی ماہر سرجن کامیابی کے ساتھ عمل جراحی کرتا ہے۔

ان کا افسانہ "کھلا ہوا دروازہ" دراصل ٹائیگر اور ٹامی دو کتّوں کی کہانی ہے۔ ایک امریکہ میں پرورش پاتا ہے اور ایک متمول گھرانے کا پالتو جانور ہے۔ دوسرا ہندوستان کی گند آلود فضا، تنگ نظر اور تنگ دل ماحول میں پلتا بڑھتا ہے اور ایک مفلوک الحال لڑکے کی وقت گزاری اور دلچسپی کا ذریعہ بنتا ہے۔ ٹائیگر ایک سفر پر اپنے مالک اور اس کے بچّوں سے بچھڑ کر گم ہو جاتا ہے اور اس کی بازیافت پر اس کے کیا کیا چونچلے ہوتے ہیں اور کیسے کیسے ناز نخرے اُٹھائے جاتے ہیں کہ بس خدا کی پناہ۔ بہت سے ملکوں میں کسی امیر کبیر گھرانے کے بچّے کی گمشدگی پر بھی شاید ایسے نخرے نہ اٹھائے جاتے ہوں۔ ویسے اس معاشرے میں یہ بات عام ہے کہ یہاں بہت سے متمول لوگ اپنی وصیت میں اپنے پالتو جانور کے لیے کبھی کبھی جتنا اثاثہ چھوڑ جاتے ہیں اتنا اپنے بیوی بچّوں کے لیے نہیں چھوڑتے۔ حال ہی میں ایک ایکٹریس نے اپنے کتّے کے لیے پانچ ملین ڈالرس چھوڑے ہیں۔ ان کے اس افسانے میں دو معاشروں میں جو تضاد ہے وہ بڑی خوبصورتی سے ابھرتا ہے۔ ٹامی جب چند شریر اور بدمذاق لوگوں کی کج خلقی کا شکار ہو کر زخمی ہو جاتا ہے تو وہ لڑکا اس کی شکایت لے کر تھانیدار کے پاس جاتا ہے جو اس کو خطرے کی گھنٹی سمجھتا ہے اور گولی مار کر ختم کر دیتا ہے۔

یہ افسانہ سچ پوچھیے تو دو کتّوں کی کہانی نہیں ہے بلکہ دو معاشروں کی داستان ہے۔ دو متضاد تہذیبوں کی روداد ہے۔ مشرق اور مغرب کے بہت سے تہذیبی اور معاشرتی اقدار میں جو بُعد یا تضاد ہے ان کا دردمندانہ انداز میں تجزیہ ہے۔ افسانے کے ذریعے جانوروں پر بے رحمی کے المیہ کا اک مرثیہ ہے۔ ایک معاشرے میں پالتو جانوروں کے ساتھ جو التفات، جو ارتباط برتا جاتا ہے

اس پر بڑے شگفتہ انداز میں طنز ہے۔ کتے کی دوستی پر استہزا ء ہے مگر شائستگی کے ساتھ۔ دوسرے کتے کے ساتھ جو سلوک ہوا، جو نہیں ہونا چاہیے تھا اس پر احتجاج ہے مگر اشاراتی اور راست رائی کے طور پر۔ جانوروں کی بے بسی، بے زبانی، بے چارگی پر علامتی انداز میں زہر خند ہے۔ افسانہ نگار کا مقصد ہے کہ لوگ جانوروں کو جانور نہ سمجھیں اور ان پر محبت کی بارش کریں اور ہندوستان میں بھی امریکہ کی طرح ایک محکمۂ انسدادِ بے رحمیِ جانوراں قائم ہو جانا چاہیے۔

پھر ذرا نظر دوڑائیے ان کے افسانے "ایک ہنسی بے تُکی سی" پر۔ اس میں ایک مسلمان لڑکی صابرہ جو ایک مخصوص معاشرے میں پلی بڑھی پھر والدین کے ساتھ شمالی امریکہ چلی آئی۔ جہاں شادی کی روایت نہ جانے کتنی کینچلی بدل چکی ہے اور جہاں رفتہ رفتہ شادی کی رسومات مردہ ہوتی چلی جا رہی ہیں اور بغیر مناکحت کیے ساتھ رہنے کا رواج جڑ پکڑتا جا رہا ہے۔ صابرہ کی دوست روزمیری اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بغیر شادی کے تین چار سال گزارنے کا پروگرام بناتی ہے۔ صابرہ اپنے ملک کی روایات کا احترام کرتے ہوئے اپنے ماں باپ کے طے شدہ رشتے پر حامی بھر لیتی ہے اور ان کی زندگی باوجود کسی EXCITEMENT کے مناسب طریقہ سے گزر جاتی ہے ______ حتیٰ کہ اس کی بیٹی بھی شادی کے لائق ہو جاتی ہے۔ اس عرصے میں صابرہ کی دوست روزمیری کی شادی بھی ہوتی ہے۔ طلاق پھر کسی کے ساتھ رہائش اور یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے اور آخر کار اس لڑکی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی ان پابندیوں کی اسیر کیوں نہیں ہوئی جس کی صابرہ ہوئی اور جو اس کی زندگی بھی مسرت سے ہمکنار کر دیتے۔

رضا الجبّار کے اکثر افسانوں میں جو دو مختلف تہذیبوں کی آئینہ داری ہوتی ہے وہ بڑی چابکدستی اور خوبصورتی سے انجام پاتی ہے۔ تخلیق کار ایک ماہر نبض شناس کی طرح نیک و بد میں امتیاز پیدا کرتا ہے مگر اس کا

انداز نہ مولویانہ ہوتا ہے نہ معلمانہ بلکہ فنکارانہ۔ صابرہ جب اپنی دوست روزمیری کو اپنی بیٹی کی شادی کا کارڈ پکڑاتی ہے تو وہ لفافے میں سے خوب صورت ڈیزائن کے کارڈ کو نکال کر خاموشی سے پڑھنے لگتی ہے۔ بہت دیر تک کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دعوت نامے کے الفاظ اُبھر اُبھر کر کانٹے بن رہے ہوں اور روزمیری کی نگاہیں ہاتھ بن گئے ہوں۔ اپنی نگاہوں کے ہاتھوں سے ان ابھرے ہوئے الفاظ کو کھروچ کر روزمیری اپنے منہ میں رکھ رہی ہے۔ وہ الفاظ کو چبا رہی ہے تاکہ الفاظ کانٹے نہ بنیں، نرم اور ملائم ہی رہیں۔ امریکہ میں پلی ہوئی عورت کے جذبات کی عکّاسی اس بھرپور انداز میں کی گئی ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رضا الجبار روزمیری کے ذہنی کرب اور روحانی اضطراب کا تجزیہ آگے چل کر یوں کرتے ہیں:

"صابرہ نے محسوس کیا کہ روزمیری کی ہنسی معمول سے مختلف ہے۔ صابرہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ روزمیری کی ہنسی ایک آئینہ ہے۔ اس آئینے کی سطح پر وہ اپنی نمائش کے ساتھ فریاد بھی کر رہی ہے کہ دیکھو میں ٹوٹ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہوں۔ میرے بدن کے اندر کرچیں ہیں، کانٹے ہیں اور رِستے ہوئے خون کے ساتھ زخم اتنے ہیں کہ ان کا حساب نہیں۔"

شادی کے رسم و رواج کے تعلق سے دو معاشروں کی اقدار پر یہ ایک لطیف طنز بھی ہے اور تیز نشتر بھی۔ دو عورتوں کے اندر جو کرب چھپا ہوا ہے اس کا اظہار ہے، دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کا قصّہ ہے۔ اس افسانے کا نہ کوئی ہیرو نہ ہیروین۔ خود دو مختلف معاشر کے افراد اور اوصاف اس کے مرکزی کردار ہیں۔

ان کا افسانہ "اعتماد" رنج و محن سے معمور ہے۔ اس کو آپ جتنی بار بھی پڑھیں گے آبدیدہ ہو جائیں گے۔ المناک سچویشن کے لیے جس قسم کے الفاظ درکار ہیں وہ ان کی گرفت میں ہیں۔ اس کے بارے میں کرشن چندر بہت پہلے بڑی

خوب صورت یہ بات کہہ گئے ہیں " زبان و بیان کے معاملے میں رضاء الجبّار بہت محتاط واقع ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں وہ افراط، مبالغہ اور طولانی کے قائل نہیں ہیں۔ زبان سادہ اور صحیح ہوتی ہے۔ فقرے چست اور چھوٹے مسلسل ندی کی طرح رواں لیکن پاٹ چوڑا نہیں۔ منضبط اور مربوط نثر لکھتے ہیں جو کہانی کے ساتھ گویا چپکی ہوئی اور رمنڈھی ہوئی آخر تک چلی جاتی ہے۔ کہیں پر جھول، بے محل افکار یا فالتو گفتگو کا احساس نہیں ہوتا۔" پریم چند کے بعد اُردو کے عظیم ترین افسانہ نگار کے ان جملوں کو نظر میں رکھیے اور پھر 'اعتماد' پڑھیے۔ وہ طاہرہ کی موت جو کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے واقع ہوتی ہے اور اس کا جو تاثر مرحومہ کی پانچ سال کی بچّی پر ہوتا ہے اس کو کس نزاکت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ بچّی اپنے باپ کو آنگن کے اس حصّہ میں لے جاتی ہے جہاں کچھ دیر پہلے اس کی ماں کی نعش کو غسل دیا گیا تھا اور پھر وہ آنگن میں اُگے چھوٹے پیڑ کے تنے کی طرف اشارہ کرکے باپ سے پوچھتی ہے بتائیے وہ کیا ہے؟ جواب ملتا ہے "کسی کیڑے کا بنایا ہوا مٹّی کا گھر ہے"۔ بچّی کہتی ہے "ہاں ہے۔ یہ اوپر سے کھُلا ہوا ہے ڈیڈی۔ پہلے یہ کھُلا ہوا نہیں تھا۔ ہر طرف سے بند تھا اور ایک بدشکل کیڑا اس میں قید تھا۔ جب وقت آگیا تو اس کیڑے کے پنکھ پیدا ہوئے..... وہ بہت خوب صورت تتلی بن گیا۔ اب وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور سارے پھولوں سے اس نے دوستی کرلی۔ وہ پھولوں کو اپنا گیت سناتا ہے اور پھول اسے اپنا رنگ دیتے ہیں۔ یہ بات ممّی نے مجھے بہت پہلے بتائی تھی۔ پھر نیند آنے سے پہلے جب وہ جاگ رہی تھیں تو انھوں نے مجھے بتایا کہ انھیں بھی اب پنکھ ملنے والے ہیں اور وہ پری بن جائیں گی۔ پھولوں کے ایک بہت بڑے باغ میں وہ خوب گھومیں گی۔ تب ان کے بڑے بڑے پنکھ تمام پھولوں کے رنگ اور خوشبو لے کر بہت خوب صورت ہوجائیں گے۔ ان خوب صورت پنکھوں کو لیے وہ اُڑتی اُڑتی آپ کو اور مجھے دیکھنے کے لیے آئیں گی۔" "آپ کی آنکھوں

میں پانی آرہا ہے ڈیڈی" "اور ممی نے یہ بھی کہا تھا کہ میں ان لوگوں کو یہ بات بتا کر تسلّی دوں، رونے سے انھیں روک دوں۔ اس لیے ڈیڈی آپ رونے سے باز آجائیے۔" اس عبارت کا ایک ایک لفظ تیر کی طرح جگر میں ترازو ہو جاتا ہے۔ معصوم بچّی کی زبانی موت کی المناک داستان جس طور بیان کی جاتی ہے وہ میر انیس کے مراثی کی یاد دلاتی ہے۔ وہی درد، وہی دردناک کیفیت وہی غم انگیز سماں جو انیس کی نظم میں نظر آتا ہے وہ رضاء الجبّار کی نثر میں بھی ہویدا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ طاہرہ کی نعش ابھی ابھی آنگن سے تجہیز کے لیے لے جائی گئی ہے اور پھر وہ تتلی بن کر گھر واپس آگئی ہے اور آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جیسے وہ ڈیڈی آپ خود ہیں اور وہ آپ ہی کی بچّی اپنی ماں کی موت اور اس سے مستقل جدائی کا جواز اپنی بچکانی زبان میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہے، انسانی نفسیات کا جائزہ اس سے زیادہ خوبصورتی سے کیونکر لیا جا سکتا ہے۔

یہاں رضاء الجبّار کی ہر کہانی کا تجزیہ مقصود نہیں ہے کہ وہ جوئے کے چھکّے سے آگے نکل کر پوری ایک سینچری اس میدان میں لگا چکے ہیں اور ان کی تخلیقات افسانوں کی شکل میں سنّو کے لگ بھگ ہوں گی۔ یہاں وہ باتیں مختصراً بیان کر دینا چاہتا ہوں جو میرے ذہن میں ان کی کہانیوں کو پڑھ کر آئیں۔

اب یہ بات قابلِ قبول کہ ہر تخلیق کار اپنی تخلیق کا سب سے پہلا قاری اور ناقد ہوتا ہے۔ رضاء الجبّار کا شمار دراصل اسی صف کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہر تخلیق کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں۔ پوری طرح کسوٹی پر کستے ہیں جب تک پوری طرح مطمئن نہیں ہو جاتے، اس کو منظرِ عام پر نہیں لاتے۔ وہ ایک سچے اور مخلص فنکار کی طرح وہی لکھتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں۔ خیالی اور قیاسی باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ منافقانہ رویّے اور تقلیدی انداز

سے احتراز۔ وہ کسی مخصوص تکنیک کے پیروکار نہیں ہیں بلکہ نفس مضمون اور افسانے کی تفہیم کے تعلق سے تکنیک کا انتخاب کرتے ہیں، وہ ایک بلند فکر اور وسیع النظر فنکار ہیں۔ کوئی مخصوص طرزِ نگارش یا اسلوب ان سے منسوب نہیں کیا جاسکتا اور نہ وہ کسی تحریک، چاہے وہ ترقی پسندیت ہو یا جدیدیت، اس حد تک متاثر نہیں کہ اسی کے مقلد اور معتقد ہو کر رہ جائیں۔ ان کی کہانیوں میں نہ نعرے بازی کا عنصر نظر آتا ہے نہ علمبرداری کا تصوّر، نہ وہ سرخ جھنڈے اپنے افسانوں میں لہراتے ہیں، نہ ہتھوڑا اور درانتی کا پرچار کرتے ہیں، نہ ہی ان کے یہاں ترنگا پرچم جھل مل جھل مل کرتا نظر آتا ہے۔ ——— وہ ان سب محدود نظریات یا رجحانات سے بلند ہو کر ایک اعلیٰ سطح پر سوچتے ہیں اور معیاری فن تخلیق کرتے ہیں۔ آئے دن حالات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور مختلف رویّے اور نظریے ہمارے اردگرد پرورش پاتے رہتے ہیں ان کا اظہار بغیر کسی 'ازم' کے پابند ہوئے مفکرانہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں کرتے ہیں۔

کردار نگاری ان کی افسانہ نگاری کا اصل جوہر ہے۔ ان کے کردار نہ دیومالا کی کہانیوں سے ماخوذ ہوتے ہیں نہ ہی قدیم اساطیر سے مستعار۔ بلکہ وہ ہمارے گردوپیش چلتے پھرتے، رہتے بستے، جیتے جاگتے رواں دواں قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن سے ہم آئے دن ملتے رہتے ہیں مگر ان کی بہت سی اُن خوبیوں یا خرابیوں کو دیکھ نہیں پاتے جو رضاء الجبّار کی دوررس نگاہیں دیکھ لیتی ہیں۔ وہ ہر کردار کی خصوصیات اور جزئیات کو ماہرِ فن کی طرح جانچتے پرکھتے ہیں اور پھر اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے کردار نہ ہمیں گنجلک نظر آتے ہیں نہ مبہم بلکہ ان کے مختلف روپ ہماری نظروں کے سامنے صاف شفاف پانی کی طرح آجاتے ہیں اور ہم کو سمجھنے میں دقّت نہیں ہوتی کہ وہ سب کے سب بڑے متحرک اور فاعل قسم کے لوگ ہیں۔ یہی کیفیت ہم کو ان کی واقعہ نگاری میں بھی ملتی ہے۔ واقعات پیش کرتے وقت ان کو اس کا احساس رہتا ہے کہ

فضا بہت ہی پُر اسرار اور ماورائے فطرت نہ ہو جائے اور اسلوب ڈرامائی انداز نہ اختیار کرلے۔ بلا وجہ فلسفیانہ موشگافیوں سے وہ حتی الامکان گریز کرتے ہیں۔ واقعہ کو وہ عام فہم، عام پسند، سادہ، سلیس اور فصیح انداز میں پیش کرتے ہیں۔ زبان و بیان میں ابہامیت، ایمائیت اور اشاریت کو زیادہ دخل انداز نہیں ہونے دیتے ہر چند کہ افسانوں میں ان کا انداز نگارش زیادہ تر بیانیہ ہوتا ہے مگر وہ تلخ و ترش حقائق کی عکاسی اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو نہ تھکن محسوس ہوتی ہے نہ گھٹن، نہ کسیلا پن حلق کا ذائقہ خراب کر دیتا ہے، نہ کڑوا پن ان کی تحریر کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ وہ مسائل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اس کا تجزیہ بھی کرتے جاتے ہیں اور اپنے ناظر کو اس طرح اپنے ساتھ رکھتے ہیں کہ وہ ایک لمحہ کے لیے نہ دل برداشتہ ہوتا ہے نہ برافروختہ۔ حادثاتِ زمانہ، سانحات اور تجربات انسانی کو وہ انتہائی وسیع اور متنوع تناظر میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی کہانیوں میں موضوع اور مواد کی رنگارنگی، تجربے اور مشاہدے کی گہرائی بڑے بھرپور انداز میں ملتی ہے۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ دونوں بین الثقافتی، بین اللسانی اور بین المملکتی ہے اس لیے ان کی فکر و نظر بھی کسی ایک محور کے اردگرد نہیں گھومتی ہے بلکہ اس میں آفاقیت ہے، عالمگیریت ہے۔ ان کی جبلت میں جو مشرق و مغرب کی فضا، رچاؤ اور مختلف تہذیبوں کا رکھ رکھاؤ ہے، اس نے ان کے افسانوں کو جو روپ انوپ عطا کیا ہے وہ انھیں مختلف رنگوں کا حسین و جمیل امتزاج ہے۔

افسانے
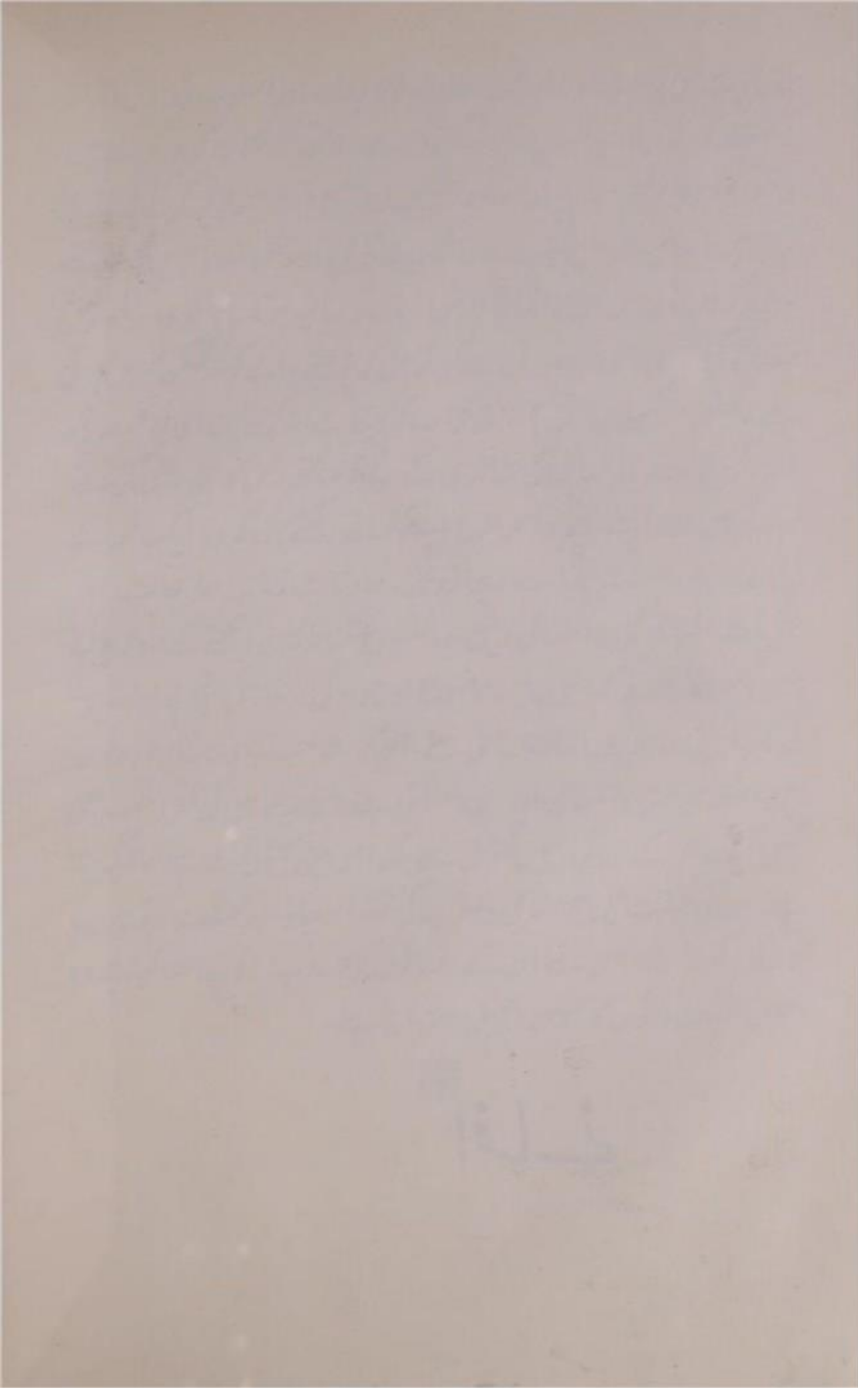
اعتماد

ڈاکٹروں نے علیحدگی میں مجھے یہ بات بتادی تھی کہ طاہرہ کا کینسر اتنا بڑھ چکا ہے کہ اب اس کا چار چھے دنوں سے زیادہ زندہ رہنا معجزہ ہوگا۔ تب ایک طرف طاہرہ کا ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوٹ جانے کا غم مجھے بے حال کر رہا تھا تو دوسری طرف یہ خیال بھی مجھے بے انتہا نڈھال کر رہا تھا کہ میں اپنی چھوٹی بچّی عالیہ کو تسلّی کیسے دے سکوں گا۔ اپنے سر پر پانچ سال کی بہاروں کا بنایا ہوا تاج پہننے والی عالیہ اپنی ماں کے بغیر ناشتہ نہیں کرتی تھی۔ ماں کی صورت دیکھے بغیر اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ طاہرہ کی حالت ہر روز گرتی جارہی تھی۔ بے ہوشی کا غلبہ پڑنے سے قبل عالیہ طاہرہ کی بانہوں میں تھی اور دونوں میں خوب خوب باتیں ہوتی رہیں۔ ایسی لاڈ و پیار کی باتیں جو بچّوں اور بڑوں کے درمیان ہوتی ہیں، جو ایک جُدا ہونے والی ماں اور جا رہے جانے والی بیٹی کے درمیان ہوسکتی ہیں۔ عالیہ کو سوالات کرنے کی خوب عادت ہے۔ ممی یہ کیا ہے، ممی ایسا کیوں ہوتا ہے، ممی اس کے بعد کیا ہوگا؟ عالیہ جب میری گود میں اور میرے ساتھ ہوتی ہے تب بھی وہ اسی طرح بات میں بات نکال کر سوالات کرتی جاتی ہے۔ اب جبکہ اس کی ماں اس سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گی۔ ناشتہ کرتے وقت اور رات کو سونے سے قبل اپنی ماں کے

ہاتھوں کا لمس اور اپنے سوالات کے جواب نہیں پائے گی تو وہ کتنا روئے گی۔ میں کیوں کر اسے صبر کی تلقین دے سکوں گا اور ماں کی وفات کے بارے میں اسے کیسے سمجھا سکوں گا؟

بے ہوش ہونے سے پہلے طاہرہ نے مجھے رکتے رکتے کہہ دیا تھا کہ ہم لوگ عالیہ کی گڑیا کی شادی کریں گے۔ شادی سے قبل دور رہنے والی رشتے دار گڑیاں مہمان بن کر آئیں گی۔ عالیہ ان مہمانوں کی خاطر تواضع خوب دل کھول کر کرے گی۔ نسیمہ باجی کے گھر کا باغیچہ اس کی گڑیا کی شادی کے لیے لے لیا جائے گا۔ وہاں سب بچے جمع ہوں گے اور عالیہ کی گڑیا کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوگی۔ یہ سب دو چار دنوں کے بعد ہوگا تاکہ عالیہ کا دل لگا رہے۔ میرا ماتھا بڑی زور سے ٹھنکا۔ کیا طاہرہ کو اپنی زندگی کے ختم ہو جانے کا پتہ چل گیا ہے۔

اسی شام کو میں بازار سے دس گڑیں خرید کر لے آیا۔ ساتھ میں چولھے، چوکی اور خانہ داری کے بھی کھلونے تھے۔ عالیہ خوشی سے پھولی نہیں سمائی۔ اس نے تمام سامان کو قرینے سے سجایا۔ چولھا، توا، گردا بیلن، رکابیاں، چمچے، کٹورے، سماور، کنگال، مٹکے اور دوسرے برتن۔ ہر صبح مہمان لوگ ناشتہ کرنے سے پہلے غسل کیا کریں گے اور چونکہ نل کو جلد بند ہو جانے کی پرانی عادت ہے، اس لیے صبح کو اٹھنے کے ساتھ ہی پانی برتنوں میں بھر بھر کر رکھ لینا ہوگا۔ کسی ذمہ دار فرد کی طرح اپنے آپ سے وہ خود ہی کہتی جاتی تھی۔ اس نے اپنی ہم عمر پڑوسی لڑکیوں سے یہ بھی کہا۔ "افوہ! اتنے زیادہ مہمان گھر میں آجائیں تو کوئی کیسے ساری باتوں کا خیال رکھے۔ نا بابا میں تو بہت تھک جاؤں گی۔" تب پڑوسیوں کی ایک لڑکی ثمینہ نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ ہر روز صبح آکر عالیہ کی مدد کرے گی تاکہ اتنے زیادہ مہمانوں کے آرام کا خیال رکھنے کی ذمے داری بٹ جائے۔

طاہرہ بے ہوش ہو گئی۔ اسے آکسیجن پر چڑھایا گیا تاکہ زندگی کی رمق چند گھنٹوں ہی کے لیے سہی دوبارہ اسے مل جائے اور وہ کچھ کہہ سکے، کچھ سن سکے، اپنی بچی کو چند ثانیوں کے لیے ہی دیکھ لے۔ زندگی کا سورج جب موت کی سیاہی میں اپنا

وجود کھونے کے لیے بتدریج بڑھتا ہے تو اس کی روپہلی کرنوں کا بانکپن رہ رہ کر یاد آتا ہے اور بے قراریوں کے طوفان بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ گھر میں رشتے داروں کا آنا شروع ہوا۔ سب کے چہروں پر دکھ اور افسوس کے نقوش گہرے ہونے لگے۔ عالیہ اپنی گڑیوں میں مگن تھی۔ میں نے کوشش کی کہ وہ مصروف رہے۔ وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ کھیلتی رہی۔ کھیلتے کھیلتے تھک جاتی تھی تو آکر اپنی ماں کی صورت دیکھتی اور سو جاتی تھی۔ ثمینہ نے جب عالیہ سے پوچھا کہ اس کی ماں کو کیا ہوا تو اس نے ثمینہ کو سمجھایا۔

"میری ماں بہت تھک گئی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر چاچا نے انھیں دوائیں اور انجکشن دیے ہیں تاکہ وہ خوب سوتی رہیں اور ان کی تھکن ختم ہو جائے۔"

اسی رات کو طاہرہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ گھر میں سب جاگ رہے تھے۔ تسبیح کے دانے پھیر پھیر کر دعائیں کر رہے تھے کہ مرنے والی کی روح کو ثواب ملے، اسے جنّت میں جگہ ملے۔ عزیز و اقارب اپنے آنسوؤں پر بے قابو ہونے لگے۔ صبح جب عالیہ اٹھی تو میں نے اسے الگ لے جا کر یاد دلایا کہ فلاں دن اس کی گڑیا کی شادی طے کر دی گئی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیوں نہ دو تین دنوں کے لیے یہ شادی ملتوی کر دی جائے کیوں کہ جب تک اس کی ممی بھی اپنی نیند پوری کر کے جاگ جائے گی اور انھیں بھی ساتھ لے لیا جائے گا۔ میں نے عالیہ کو سمجھایا کہ نسیمہ باجی کا باغیچہ گڑیا کی شادی کے لیے صرف اسی دن ملے گا۔ اس لیے اس اچھے موقع کو ملتوی نہیں کرنا چاہیے اور ملتوی کرنے پر ممی بھی خوش نہیں ہوں گی۔ عالیہ راضی ہو گئی۔

عین اس وقت جب سارے بچّے نسیمہ باجی کے گھر جانے کے لیے گڑیوں اور سامان کے ساتھ کار میں بیٹھ رہے تھے ثمینہ نے عالیہ سے کہا کہ اس نے اپنی ممی کو فون پر بات کرتے ہوئے سُنا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ طاہرہ کی روح اس کے جسم سے پرواز کر گئی ہے۔ کار میں سے اُتر کر عالیہ میرے پاس آئی اور پوچھا "ڈیڈی روح کیا ہوتی ہے؟"

میں عالیہ کے اس سوال پر کسی قدر پریشان ہوا کہ اسے کیا جواب دوں، لیکن عالیہ بغیر جواب لیے رہ نہیں سکتی تھی۔ اسے کچھ نہ کچھ جواب دینا ضروری تھا۔ میں نے

دبے دبے الفاظ میں کہا" روح خدا کا تحفہ ہے جسے وہ جب چاہتے ہیں دیتے ہیں اور جب چاہے لے لیتے ہیں۔ اب آگے کی باتیں تفصیل چاہتی ہیں اس لیے بیٹی میں تمھیں شام کو بتاؤں گا۔"

طاہرہ کی تجہیز و تکفین کے بعد جب میں گھر پہنچا تو سب لوگ رہ رہ کر اس کی باتیں یاد کر رہے تھے اور غم سے میرا بھی بُرا حال تھا۔ گھر کے تمام گوشوں میں طاہرہ حرکت کرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ زیادہ تر عالیہ کو لیے ہوئے۔ میں اس حد تک ضبط کرتا رہا جتنا کہ مجھ سے ممکن تھا۔

شام زیادہ ہوئی تو عالیہ اپنی سہیلیوں اور اپنی گڑیوں کے ساتھ کھیل ختم کر کے نسیمہ باجی کے گھر سے واپس آئی۔ میری بہنیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں کہ معصوم بچی ماں کے سائے سے محروم ہو گئی، کتنی بد قسمت ہے بے چاری۔

عالیہ گھر میں داخل ہوئی۔ سب سے پہلے اپنی چیزوں کو قرینے سے رکھا۔ پھر شادی کی باتیں اپنی ماں کو بتانے کے لیے وہ اس پلنگ کے پاس گئی، جس پر کل تک طاہرہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور صبح اس کی لاش یوں رکھی تھی جیسے وہ سو رہی ہے۔ سب کی نگاہیں عالیہ کا تعاقب کر رہی تھیں۔ پلنگ پر طاہرہ کو نہیں دیکھا تو اسے ڈھونڈھنے کے لیے وہ چپ چاپ اندر کے کمروں کی طرف چلی گئی۔ طاہرہ وہاں بھی نہیں تھی۔ کمروں میں سے ہوتی ہوئی عالیہ باہر آئی اور مجھ سے پوچھا۔

"ممی کہاں ہیں ڈیڈی؟"

میں نے اپنے آپ کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تمھاری ممی اسپتال گئی ہیں۔ جب وہ اچھی ہو جائیں گی تو آجائیں گی۔ وہ جلد آجائیں گی۔ دو چار دن صبر کرو بیٹی۔"

عالیہ نے میرے جملوں کو غور سے سُنا۔ کوئی سوال کرنے کے بجائے اس نے پورے اعتماد سے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ ممی کہاں ہیں۔ ممی نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔"

چونک کر میں نے کہا۔ "اچھا! تمھیں بتایا تھا۔ کیا بتایا تھا؟"

وہ میری کرسی کے قریب آگئی اور میرے ہاتھ کو کھینچ کر کہا۔ "ادھر آیئے میں ممی کی بات بتاتی ہوں۔"

میں عالیہ کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اُتر کر آنگن میں آگیا۔ آنگن میں پڑے ہوئے اس تخت کے بازو جس پر ابھی چند گھنٹوں قبل طاہرہ کی لاش کو نہلایا گیا تھا، ایک جامن کا درخت تھا جہاں عالیہ مجھے لے گئی اور درخت کے تنے کی ایک جانب انگلی سے اشارہ کر کے پوچھا "ڈیڈی! بتائیے یہ کیا ہے؟"

"کسی کیڑے کا بنایا ہوا مٹّی کا گھر ہے"۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں ہے۔ یہ اوپر سے کھُلا ہوا ہے ڈیڈ۔ پہلے یہ کھُلا ہوا نہیں تھا۔ ہر طرف سے بند تھا اور ایک بدشکل کیڑا اس میں قید تھا۔ جب وقت آگیا تو اس کیڑے کے پنکھ پیدا ہوئے۔ کیڑے کو بہت خوشی ہوئی اور وہ اپنے گھر کو توڑ کر باہر نکل گیا۔ باہر کی ہوا میں اس کے پنکھ زیادہ بڑے اور رنگ برنگے ہوگئے۔ وہ کیڑا خوبصورت تتلی بن گیا۔ اب وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور سارے پھولوں سے اس نے دوستی کرلی۔ وہ پھولوں کو اپنا گیت سناتا ہے اور پھول اسے اپنا رنگ دیتے ہیں۔ یہ بات ممی نے مجھے بہت پہلے بتائی تھی۔ پھر نیند آنے سے پہلے جب وہ جاگ رہی تھیں انھوں نے مجھے بتایا کہ انھیں بھی پنکھ ملنے والے ہیں اور وہ پری بن جائیں گی۔ پھولوں کے ایک بہت بڑے باغ میں وہ خوب گھومیں گی تب ان کے بڑے بڑے پنکھ تمام پھولوں کے رنگ اور خوشبو لے کر بہت خوبصورت ہو جائیں گے۔ ان خوبصورت پنکھوں کو لیے وہ اُڑتی آپ کو اور مجھے دیکھنے کے لیے آئیں گی۔ آپ کی آنکھوں میں کیوں پانی آرہا ہے ڈیڈ؟ جنھیں اُڑنے کے لیے بڑے بڑے پنکھ ملیں گے وہ کس طرح مٹّی کے دبے ہوئے گھروں میں رہ سکیں گے؟ ممی نے سچ کہا تھا کہ جو لوگ اس بات کو نہیں سمجھیں گے وہ روتے ہوئے نظر آئیں گے اور ممی نے یہ بھی کہا تھا کہ میں ان لوگوں کو ان کی یہ بات بتا کر تسلّی دوں۔ رونے سے انھیں میں روک دوں۔ اس لیے ڈیڈی آپ رونے سے باز آجائیے.....!"

وٹامن کی گولیاں

موسم سرما میں جب برفباری ہوتی ہے تو خزاں زدہ درخت کی ٹہنیوں کے اوپری حصّے برف سے لد جاتے ہیں اور برف باری کے بعد جب بادل چھٹتے ہیں اور نحیف و لطیف دھوپ نکلتی ہے تو منجمد برف خوب چمکتی ہے۔ جارجٹا پے بن کی آنکھوں میں جو چمک تھی وہ ایسی ہی تھی۔ جارجٹا کے چہرے اور گردن کے بہت سے حصّوں پر جھلیاں لٹک رہی تھیں اور یہ لٹکی ہوئی چمگادڑیں اپنے سر اُٹھا کر اُس کی ستر پچھتر سالوں کی عمر کا پتہ دے رہی تھیں لیکن جارجٹا کی آنکھوں میں جو چمک تھی اور اس کے ہونٹوں پر جو شاداب مسکراہٹ نمودار ہوا کرتی تھی ان کی نوعیت ہی الگ تھی۔ اس مسکراہٹ و چمک کا رشتہ جارجٹا کی عمر کے سالوں سے نہیں معلوم پڑتا تھا۔ ان کا رشتہ اگر کسی سے معلوم ہوتا تو وہ تھیں تازہ تازہ بنائی ہوئی چٹ پٹی اور گرم گرم مصالحےدار چیزیں جنھیں لوگ تفریح گاہوں میں کھڑے کھڑے ہی کھا لیتے ہیں۔

میں نے جارجٹا کو کئی بار دیکھا۔ دیکھ کر بس انجان ہو گیا نہ اس کی کوئی مسکراہٹ لی اور نہ اس کو کوئی مسکراہٹ دی۔ اس ملک میں حکومت کے سوا ایسے بوڑھے لوگوں کو کون پوچھتا ہے تو پھر میں کیوں ایک خزاں زدہ خاتون کو اس بات کی شہ دوں کہ وہ

مجھ کو مخاطب کرے اور باتوں باتوں میں اپنے ماضی کی خوب اوٹ پٹانگ باتیں کر کے اپنے دل کا بخار نکالے۔ میں ایسی بوریت سے ہمیشہ بچنے کا خواہش مند رہتا ہوں۔ اوٹوا کے اس ریسٹورنٹ میں جو گرے ہاؤنڈ بس ٹرمنل سے ملحق ہے میں نے جارجٹا کو کئی بار دوپہر کا کھانا کھاتے یا کوئی ڈرنک خریدتے ہوئے دیکھا ہے۔ ریسٹورنٹ کی میزوں پر کھانے پینے کی چیزیں مہیا کرنے والی لڑکی ڈورین کو جارجٹا کا بڑا خیال رہتا تھا۔ جوں ہی جارجٹا ریسٹورنٹ میں داخل ہوتی ڈورین اس کی میز کی طرف جاتی اور جارجٹا کے کھانے پینے کے آرڈر لیتی اور بڑی ہمدردی کے ساتھ اس سے باتیں کرتی۔ میرا اندازہ تھا کہ جارجٹا ریٹائرڈ ہو چکی ہے اور اسے گورنمنٹ سے پنشن مل رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس پنشن پر اکتفا نہ کرتے ہوئے وہ کوئی ہلکی پھلکی ملازمت کر رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی اوقات گزاری کے لیے اس نے کوئی کام بلا معاوضہ قبول کیا ہو۔ سوشل ورکر کی حیثیت میں۔ بہت سی ضعیف عورتیں ایسا کرتی ہیں۔

آج میں جارجٹا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اسے میں اپنی مسکراہٹ دینا چاہتا ہوں اور اس سے گفتگو کرنے کا خواہشمند ہوں۔ میرے سوچنے کے زاویے بدل جانے کی وجہ یہ ہے کہ ابھی حال میں میں نے تجارت شروع کی ہے۔ کینیڈا کی ایک بڑی کمپنی کی بنائی ہوئی وٹامن کی گولیاں فروخت کرنے کی میں نے ایجنسی لے لی ہے۔ جارجٹا جیسی خاتون ٹی۔ وی پر میرے بزنس کا اشتہار بن سکتی ہے۔ وٹامن کی خوبیاں، خصوصیات اور اثرات بتانے والے کتابچے میں میں جارجٹا کی تصویر دوں گا۔ اس کے حالات اور عمر کے بارے میں لکھوں گا تاکہ پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ بات آسکے کہ میری ایجنسی کی گولیاں استعمال کرنے والے افراد کی عمر ایسی ہی بڑی ہو سکتی ہے کیونکہ ان کی صحت اور جسمانی حالت اتنی ہی اچھی ہو جائے گی جیسی کہ جارجٹا کی ہو گئی ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں جارجٹا کو ان وٹامن کی گولیوں کے فوائد کے بارے میں قائل کر دوں گا اور وہ رفتہ رفتہ ان کی مستقل خریدار بن جائے گی۔

انتظار کرتے کرتے آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر گیا اور دوپہر کے کھانے کا وقت سرکنے لگا تو مجھے یوں لگا کہ آج جارجٹا سے شاید ملاقات نہیں ہو گی۔ جارجٹا کی غیر حاضری

کے بارے میں میں نے ڈورین سے پوچھا۔ اس نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا جیسے کوئی بات یاد آگئی ہو اور آنکھوں کی پتلیاں نچا کر بولی :

"ہاں کل جارجٹا نے کہا تھا کہ وہ دو دن نہیں آئے گی۔"

مجھے یوں لگا جیسے ڈورین کہہ رہی ہے "جس کا آپ انتظار کرتے ہیں وہ نہیں آتا، چاہے وہ جارجٹا ہی کیوں نہ ہو۔"

میں نے چونک کر پوچھا "کوئی وجہ بتائی ——؟" پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آئی۔ مجھے اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے کہ میں جارجٹا کے نہ آنے کی وجہ پوچھوں لیکن ڈورین کو میری بات پر ہنسی نہیں آئی کیونکہ اس نے وجہ بھی بتائی۔

"وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی ایک دوست کی برتھ ڈے ہے اور وہ اس کے گھر جا کر ایک دن گھر کی صفائی اور دوسرے دن برتھ ڈے پارٹی کے لیے اس کی مدد کرے گی۔"

"بہت خوب - یہ بہت قابلِ قدر جذبہ ہے۔" میں نے کہا۔

"میرے لیے غیر معمولی بھی ہے کیونکہ جارجٹا نے ایسی کسی وجہ کے ساتھ پچھلے کئی سالوں میں کبھی ایک ساتھ دو دن کی چھٹی نہیں لی۔ میں اس ریسٹورنٹ میں اٹھارہ برس سے کام کر رہی ہوں۔ جارجٹا کو میں نے پابندی سے دیکھا ہے۔ جرالڈ تیس برس سے یہاں منیجر ہے اس کا کہنا ہے کہ اس نے جارجٹا کو لمبی چھٹی لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"مطلب یہ ہے کہ تیس برس سے وہ یہیں پر لنچ لینے آتی ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"اس سے بھی زیادہ۔" ڈورین نے زیادہ پر زور دیا۔ "جرالڈ سے پہلے یہاں اس کا بڑا بھائی اسٹیفن منیجر تھا۔ ریسٹورنٹ کا افتتاح ہونے کے بعد سے کوئی بیس پچیس برس تک اس نے بھی جارجٹا کو پابندی سے دیکھا۔ اس طرح سے چالیس پینتالیس سالوں کا عرصہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔"

"مائی گاڈ" میں نے حیرت سے کہا اور دل میں فیصلہ کیا کہ جب جارجٹا کی تصویر

میرے کتابچے میں شائع ہوگی تو یہ باتیں جو ڈورین، جرالڈ اور اسٹیفن کے حوالے سے معلوم ہوئی ہیں تحریر کے شکنجے میں آجائیں گی۔ ٹی وی کا پروگرام ہوگا تو کامنٹری کی مالا میں پرو دی جائیں گی۔

مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہونے لگا کہ میں نے جارجٹا کی ضرورت محسوس کی اور وہ اسی دن نہیں آئی۔ اگلے دن مجھے کسی کام سے ایک ہفتہ کے لیے مونٹریال جانا تھا۔ یہ پروگرام بہت دنوں قبل بنا تھا۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ میں اگلے ہفتے کے بعد ہی جارجٹا سے مل سکوں گا۔

میں مونٹریال چلا گیا۔ اوٹوا سے مونٹریال جانے میں مجھے لگ بھگ پونے تین گھنٹے لگے۔ دو دن اپنے کام میں بے حد مصروف رہا۔ تیسرے دن دوپہر کے بعد تین چار گھنٹے فری مل گئے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ بلا مقصد مونٹریال کی سڑکوں پر کار دوڑائی جائے۔ مونٹریال کی خوبصورت عمارتیں، بڑی بڑی سڑکوں کے اُتار چڑھاؤ، شاہراہوں پر تعمیر کیے ہوئے دلکش مجسمے اور فرانس کی تہذیب کی پرچھائیاں رکھنے والا یہ بڑا شہر مجھے بے حد پسند ہے۔ اس لیے جب بھی مجھے یہاں آنے کا موقع ملتا ہے تو سڑکوں پر بلا مقصد گھومنے کا پروگرام بھی بنا لیتا ہوں۔ میں زیادہ تر شہر کے وسط میں گھومتا رہا جسے یہاں کی عام زبان میں "ڈاؤن ٹاؤن" کہتے ہیں۔ اچانک گرے ہاؤنڈ بس ٹرمنل کے قریب ایک چھوٹی اسٹریٹ کی سائیڈ واک پر میں نے جارجٹا کو جاتے ہوئے دیکھا۔ میری کار مخالف سمت میں تھی اور راستے اتنے مصروف تھے کہ میں کار کو پلٹا کر جارجٹا کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ کچھ آگے سڑک کے کنارے کار پارکنگ کا ایک میٹر بھی خالی مل گیا۔ میں نے جھٹ پٹ کار کو پارک کیا۔ میٹر میں پیسے ڈالے اور اسے آن کر کے اس رُخ پر بھاگا جس پر کہ میں نے جارجٹا کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اوٹوا میں کام کرنے والی جارجٹا بدھ کے روز بھی مجھے مونٹریال کے ڈاؤن ٹاؤن میں نظر بھی آسکتی ہے۔ ہفتہ اتوار کی بات الگ ہوتی ہے۔ لوگ ویک اینڈ کا پروگرام بناتے ہی ہیں۔ پانچ بجے شام کا وقت تو دفتر کے چھوٹنے کا

وقت ہے۔ جارجٹا اوٹوا ہی میں ہو سکتی ہے، مونٹریال میں نہیں۔ لیکن میں نے جب جارجٹا کو دیکھ لیا تو اپنی آنکھوں پر یقین آگیا۔ جارجٹا کا سامنا کر کے میں نے اسے "ہائے" کہا۔ جارجٹا نے ہائے کا جواب ہائے سے دیا۔

میں نے جارجٹا کو خوش اخلاقی سے کہا "جارجٹا! میں آپ کو جانتا ہوں۔"

"بہت خوب" جارجٹا نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور بولی۔ "میں بھی آپ کو جانتی ہوں مارٹن۔"

"کس طرح؟" میں نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

وہ ہنسی اور بولی "آپ پہلے پرائیویٹ جاسوس کے طور پر کام کرتے تھے۔ ایک کیس میں غنڈوں نے آپ کی خوب پٹائی کی تو ڈر کے مارے آپ کو یہ لائن چھوڑنی پڑی۔ اس کے بعد آپ نے انشورنس کا کاروبار شروع کیا لیکن یہ آپ کی دلچسپی کا دھندا نہیں تھا اس لیے آپ نے اسے بھی ترک کر دیا۔"

"اس کے بعد — ؟" جارجٹا خاموش ہوئی تو میں نے اسی حیرت کے لہجے میں پوچھا۔

"اس کے بعد کا حال میں نہیں جانتی کیونکہ اب آپ سینڈرا کے بوائے فرینڈ نہیں رہے ہے۔"

"اوہ آپ سینڈرا کو جانتی ہیں۔" حیرت کی جگہ اطمینان آنے لگا۔

"سینڈرا کی ماں میری بہت اچھی دوست ہے۔" جارجٹا نے بتایا۔

"بڑی اچھی بات ہے" میں نے رسمی انداز میں کہا اور آگے بولا۔ "میں نے اب ایک بزنس شروع کیا ہے جو بڑا کارآمد ہی نہیں بہت دلچسپ بھی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کو بتاؤں گا۔"

"ضرور بتائیے۔ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی بزنس کے لیے اچھی صلاح کار ہو سکوں۔" جارجٹا نے بڑا انہماک دکھایا اور بولی "اس سے قبل کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میرے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟"

"ہاں بتاؤں گا" میں نے جواب دیا "آپ گذشتہ چالیس پینتالیس سال سے متواتر اوٹوا کے گرے ہاؤنڈ بس ٹرمنل کے ریسٹورنٹ میں لنچ لے رہی ہیں۔ وہاں آپ کو آپ کی پسند کا کھانا ملتا ہے۔"

"ہاں! یہ بات درست ہے۔" جارجٹا نے کہا۔

"آپ وقت کی پابند ہیں، کبھی غیر حاضر نہیں ہوئیں۔ صرف گذشتہ ہفتے کے دوران اپنی دوست کی سالگرہ کی وجہ سے آپ دو دن دفتر نہیں گئی تھیں۔ آپ کے باس آپ کے کام سے بڑے مطمئن ہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ آپ کس طرح اس وقت مونٹریال میں ہیں۔"

"میں مونٹریال میں ہی رہتی ہوں۔ یہاں میرا گھر ہے، میرے والد مرحوم کی جائیداد ہے جو انھوں نے میرے نام چھوڑی ہے۔ میرے بڑے گھر میں میرے عزیز پالتو تین کتّے اور پانچ بلیاں ہیں۔ ان سب کو چھوڑ کر میں کہاں جاؤں گی۔

مونٹریال سے اوٹوا تقریباً پونے تین گھنٹے جانے کے لیے، اتنا ہی وقت واپسی کے لیے، دوپہر کے کھانے کے لیے تقریباً ایک گھنٹہ! پھر دفتر۔۔؟" میں حیرت سے چلایا "دفتر اور باس۔ یہ سب کہاں سے آگئے۔" جارجٹا نے ہنس کر کہا۔ "آپ کا اندازہ غلط ہے۔ میں کسی دفتر کو نہیں جاتی۔ صبح اپنے گھر پر ناشتہ کرتی ہوں۔ اپنے آٹھ عزیزوں کو کھلاتی پلاتی ہوں۔ اس کے بعد اوٹوا جانے کے لیے میں گھر سے نکل جاتی ہوں۔ جب وہاں پہنچتی ہوں تو بڑی بھوک لگتی ہے۔ اس لیے اس ریسٹورنٹ میں لنچ لیتی ہوں۔ اس کے فوراً بعد میں اگلی بس کے ذریعے مونٹریال واپس آنے کے لیے نکل جاتی ہوں۔ ڈھائی گھنٹے کا سفر، پندرہ بیس منٹ کی چہل قدمی بہرحال ۵ بجے میں مونٹریال میں۔"

"صرف دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے پانچ چھ گھنٹے کا سفر اور اتنا کرایہ" میں حیرت سے بولا "کیا مونٹریال میں ریسٹورنٹ نہیں ہیں۔"

"میں دوپہر کے کھانے کے لیے اوٹوا نہیں جاتی" جارجٹا نے کہا "لنچ محض ضمنی

سی بات ہے۔ محض اپنی بھوک کو مٹانے کے لیے، بھوک جو چہل قدمی کی ورزش سے ہوتی ہے، جو سفر کی تھکان سے ہوتی ہے۔"

"آپ کوئی خیال نہ کریں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے؟"

"ہاں! ضرور" جارجٹا نے کہا "بہت پہلے جب میں بیس اکیس سال کی تھی تب سخت بیمار ہو گئی تھی۔ اچھی ہونے کی ساری امیدیں مٹ چکی تھیں۔ میرے والد بڑے مغموم اور فکرمند رہتے تھے۔ اچانک روشنی کی ایک کرن مل گئی۔ ان کی دعائیں کام آئیں اور میں زندگی کی طرف آہستہ آہستہ واپس آنے لگی۔ جب مجھے پوری صحت حاصل ہو گئی تو میرے والد نے ڈاکٹر سے خواہش کی کہ میرے لیے ٹانک اور وٹامن کی گولیاں لکھ دیں۔ تاکہ میری کمزوری بھی ختم ہو جائے۔ ڈاکٹر کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ انھوں نے کہا کہ قدرت اور فطرت کے ہاتھوں میں صحت اور طاقت دینے کے بڑے خزانے ہیں لیکن ان کو حاصل کرنے کے لیے ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ مجھ سے تھکا دینے والی محنت اور ورزش کروانے کے لیے انھوں نے خود ہی یہ پروگرام مرتب کیا ہر روز پانچ ساڑھے پانچ گھنٹوں کا سفر کروں۔ اوٹوا جا کر آنے میں اتنا وقت لگ جاتا ہے پھر تقریباً ایک گھنٹے کا پیدل چلنا، بس ٹرمنل اور گھر کے درمیان۔ میں نے اس پروگرام کو اپنا لیا۔

پچاس برس گزر گئے میں بیمار دوبارہ نہیں ہوئی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر کبھی میں نے اپنے معمول میں تبدیلی لانے کی کوشش کی تو ماں نیچر مجھ سے ناراض ہو کر اپنی سرپرستی چھوڑ دے گی اور میں ایسی بیمار پڑوں گی کہ نہیں اٹھوں گی۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرے ترکش کے سارے تیر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ بس ایک تیر رہ گیا۔ اسے استعمال کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"اوٹوا اور مونٹریال کے درمیان آنے جانے میں ہر ماہ آپ کی کافی رقم ضائع ہوتی ہے اسے بچانے کی خاطر کوئی متبادل راستہ ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" جارجٹا ہنسی اور بولی "آپ کا تصور بڑا درست ہے لیکن اس بات کی مجھے قطعاً فکر نہیں ہے۔ میرے والد صاحب نے میرے لیے کافی رقم چھوڑی ہے۔ آمد و رفت کے لیے

ساڑھے پانچ سو ڈالر ماہانہ کے اخراجات، میرے لیے کوئی مضائقہ کی بات نہیں ہے۔ یہ ڈالر میرے کام تو آرہے ہیں۔ میں زندہ ہوں اور میرے پالتو عزیز لاوارث ہونے سے تو رہے۔ کیا یہ اچھی بات نہیں ہے؟"

"بے شک اچھی بات ہے" میں نے مصنوعی مسکراہٹ سے کہا۔ دل میں افسوس تھا کہ میری ترکیب کارگر نہیں ہوئی۔

پھر جارجٹا نے یاد کرتے ہوئے کہا "ہاں اپنے بزنس کی بات، جو آپ بتانے والے تھے، اب بتائیے گا۔"

"اوہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کبھی اوٹوا میں آمنا سامنا ہوگا تو باتیں کریں گے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ آپ کے پالتو عزیز آپ کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

"اچھا یوں ہی سہی۔ او کے بائی۔ شام کے لمحات آپ کے لیے خوشگوار ثابت ہوں۔"

"آپ کے لیے بھی۔ اپنا خیال رکھیے گا جارجٹا۔" "ہاں رکھوں گی۔"

جارجٹا چہل قدمی کرتی ہوئی اپنے گھر کی طرف جا رہی ہے اور میں بوجھل قدموں سے اپنی کار کی جانب بڑھ رہا ہوں۔ میرا یہ بڑھتا ہوا قدم مجھے احساس دلا رہا ہے کہ میرا یہ اپنایا ہوا نیا ملک چھوڑے ہوئے ملک کی طرح نہیں ہے جہاں پر بہت سی عورتوں کی زندگی وٹامن کی گولیوں کے بغیر آگے نہیں بڑھتی۔ اگر یہ ملک بھی یوں ہی ہوتا تو امکانات یہ تھے کہ میرا کاروبار دن دونی ترقی کرتا لیکن اب ——— میرا دل ڈوب رہا ہے۔ میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ میرا کاروبار ٹھپ ہے اور میں دیوالیہ ہوتا جا رہا ہوں۔

چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر

مکمل ہو کر آسمان پر تیرنے والے اس زرد چاند کے داغ میں اور میرے احساسات تلے جو چنگاری دبی ہوئی ہے ان میں ایک نسبت ہے۔ جب یہ نسبت قائم ہو جاتی ہے تب یہ دبی ہوئی چنگاری میرے احساسات میں آگ لگا دیتی ہے اور اس شعلے میں مجھے مہیش کا چہرہ نظر آتا ہے۔

مہیش سے میں ہسپتال میں ملا تھا۔ مجھے بھی ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ گھر سے پانچ سو میل کا فاصلہ طے کر کے مجھے ہسپتال میں لایا گیا تھا اور مجھے یہ بھی اطلاع تھی کہ اس ہسپتال میں مجھے ڈیڑھ سال رہنا ہوگا۔ ڈاکٹر ڈھولکیہ نے جب میرا معائنہ کیا تھا اس وقت انھوں نے میرے بابا کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تین آپریشنوں کی کامیابی کے بعد ہی وہ قطعی طور پر کچھ کہہ سکیں گے۔

میرے داخلے کے بعد جب وارڈ بوائے نے مجھے نہلا دھلا کر سفید چادروں سے ڈھکے ہوئے ایک کاٹ پر ڈال دیا تھا تب مجھے عجیب سا لگا تھا جیسے یہ میرے آخری دن ہیں۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ جسمانی درد کو سہنے کی مجھ میں سکت نہیں ہے، پھر یہ تین آپریشن میں کیوں کر برداشت کر سکوں گا۔ چار چھے دن ٹھہرنے کے بعد بابا بھی گھر واپس

ہو جانے والے تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد اکیلا رہنے کا خیال بھی میرے لیے بڑا پریشان کرنے والا تھا۔ میں تو یہ اصرار کر رہا تھا کہ مجھے آپریشن نہیں کروانے ہیں۔ بمبئی کا یہ آرتھوپیڈک ہاسپٹل اپنی نوعیت کا پہلا ہے تو رہنے دیجیے۔ جب ہمارے شہر میں بھی ایسا ہسپتال قائم ہو جائے گا، میں آپریشن کرا لوں گا۔ اس وقت بازو کے پلنگ سے مہیش کی آواز آئی۔

"میں نے بھی یوں ہی سوچا تھا۔ اپنے پتا جی سے ایسا ہی کہا تھا۔ میرے پتا جی نے بتایا تھا کہ تب تک میں بڑا ہو جاؤں گا اور بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ہڈیاں بھی سخت ہو جاتی ہیں اور آپریشن زیادہ مشکل ہو جاتے ہیں۔ بہتر یہی ہے دوست کہ جلد اپنا علاج کروا کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔"

مجھے مہیش کی نصیحت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے میں بابا کو مجبور کر رہا تھا کہ مجھے واپس لے چلو۔ مہیش دوبارہ کہنے لگا۔ اس بار اس نے میرے بابا کو مخاطب کیا تھا۔

"آپ کوئی فکر نہیں کریں انکل۔ جتنے بھی بچے یہاں آتے ہیں وہ پہلے دن روتے ہیں اس کے بعد جب انھیں پتہ چلتا ہے کہ آرتھوپیڈک ہاسپٹل کے مریض دراصل مریض کم ہوتے ہیں اور کسی بورڈنگ میں رہنے والے بچوں کی طرح زیادہ ہوتے ہیں اور انھیں اِن ڈور گیم کھیلنے کے مواقع ملتے ہیں، ہنسی مذاق کے لیے ساتھی اور پڑھنے کے لیے اتنی اچھی اچھی کتابیں ملتی ہیں تب وہ رونا بھول جاتے ہیں۔ وہ تو اپنے گھروں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ میں آپ کو کتنے ہی بچّوں کے نام بتا سکتا ہوں جنھیں اپنے ماں باپ کو خطوط لکھنے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ ان کے ماں باپ کئی بار انھیں خطوط لکھنے کے بعد جواب نہیں پانے پر پریشان ہو کر ہسپتال کے ڈاکٹروں کو خط لکھتے ہیں اور اپنے بچّوں کی کیفیت دریافت کرتے ہیں۔ اس طرح ماں باپ کے خطوط کا جواب بہت بار یہاں ڈاکٹر لوگ دیتے ہیں۔"

جملہ کہہ کر مہیش ہنسنے لگا۔ اس وقت میں نے اندازہ لگایا تھا کہ مہیش نہ صرف باتونی ہے بلکہ بڑا ہنس مکھ بھی ہے۔ اس کی باتوں میں میرا دل لگ جائے گا۔

بابا جب چلے گئے تو میں نے مہیش سے یوں ہی پوچھا تھا۔
"کیا تم بھی اپنے ماں باپ کے خطوط کا جواب نہیں دیا کرتے ہو۔"
"میری بات الگ ہے۔"

اس بار میں نے مہیش کو غور سے اور قریب سے دیکھا۔ میرے تو صرف پاؤں پر پولیو کا حملہ ہوا تھا اور میرے پاؤں ضائع ہو گئے۔ اپنے آپ کو بڑا بدقسمت سمجھنے کی میں نے عادت سی ڈال لی تھی لیکن یہاں ایک مہیش ہے جو میرے بازو کے پلنگ پر بیٹھا ہوا ہے وہ سارے جسم کا ہی مفلوج لگ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ کندھوں سے نیچے یوں لٹک رہے ہیں جیسے بوڑھے برگد کی ڈار۔ پٹھوں کی قوت ضائع ہو جانے کے باعث پیٹ آگے کی جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ صرف گردن اور اس کے اوپر رکھا ہوا سر ہی صحت مند نظر آرہے تھے۔ ہاتھ کو ہلانا ہوتا تو وہ زور سے اپنے کندھے کو جھٹکا دیتا اور لٹکتے ہوئے ہاتھ سامنے سے پیچھے یا پیچھے سے سامنے چلے جاتے۔ البتہ آنکھوں کے اندر بڑی ذہین چمک تھی۔ جب اس نے "میری بات — الگ ہے۔" کہا تو اس کی آنکھوں کی چمک کو میں نے ماند ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور آنکھیں کسی قدر نم ہو گئی تھیں۔

چار دنوں کے بعد میرا ایک بڑا آپریشن ہوا تھا' ران کی ہڈیوں کی نشو ونما غلط طرح سے ہو گئی تھی۔ اس لیے مجھے کیالیپر کے ذریعے کھڑا کرنے سے قبل ان ہڈیوں کو کاٹ کر درست کرنا ضروری تھا۔ آپریشن روم میں جانے سے قبل مہیش نے میری ہمت یہ کہہ کر بڑھائی تھی۔

"اصغر تم اپنے ذہن میں آپریشن کا ایک ڈراؤنا تصور لا رہے ہو، اس لیے تمھیں ڈر لگ رہا ہے۔ جب تم آپریشن روم میں جاؤ گے تو کلوروفارم کے انجکشن سے تمھیں بیہوش کر دیا جائے گا تب تمھیں کسی بھی بڑے آپریشن کا پتہ نہیں چلے گا۔ کئی گھنٹوں کے بعد ہوش آئے گا تو یوں لگے گا جیسے چند منٹ پہلے ہی بے ہوشی کی نیند آئی تھی۔

میرے ساتھ یہی کیفیت ہوئی تھی۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں ایک موٹے اور سخت پلستر میں جکڑا ہوا پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ پلستر تلوے سے لے کر چھاتی تک تھا۔ میں نہ اٹھ

سکتا تھا اور نہ کروٹ لے سکتا تھا۔ نیچے تلوا پلستر کے اندر تھا لیکن پاؤں کی انگلیاں ذرا ذرا باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر اور نرس انھیں بار بار ہلاتے کے لیے کہہ رہے تھے اور انھیں چھو کر معائنہ کر رہے تھے کہ وہ سُن تو نہیں ہو گئے۔ میں پریشان ہو رہا تھا کہ اس طرح سوتے سوتے میں تین مہینے کیوں کر گزاروں گا لیکن مہیش نے دوبارہ میری ہمت بندھائی۔ وہ کہنے لگا۔

"تم پلستر سوکھ جانے دو اصغر! پھر تم نرس کو کہہ کر الٹا پیٹ کے بل ہو جانا اور پیٹ کے نیچے جہاں پلستر ہے اور پنڈلیوں کے نیچے جہاں پلستر ہے بڑے بڑے دو تین تکیے رکھوا لینا۔ تب تم بڑی آسانی کے ساتھ نہ صرف لکھنے پڑھنے کا کام کر سکو گے بلکہ اپنے ہاتھ سے کھانا بھی کھا سکو گے۔"

مہیش کی بات سچ نکلی۔ الٹا ہونے کے بعد سب سے پہلے اس نے اپنی ماں کے نام مجھ سے خط لکھوایا۔ چار دنوں کے بعد پتا جی کے نام لکھوایا۔ ہر خط میں وہ اپنے بھائی اور بھابی کو یاد کرتا تھا۔ چھوٹی بہن سدھا کی اور سب سے چھوٹے بھائی رمیش کی بھی اسے بہت یاد آتی تھی۔ ہر خط میں ان سب سے ملنے اور دیکھنے کی تڑپ تھی۔ بڑی پابندی کے ساتھ ہر ہفتے دو خطوط وہ مجھ سے لکھواتا اور آیا کے ذریعے سے پوسٹ کروا دیتا۔ لکشمی بائی مہیش کی پسندیدہ آیا تھی۔ وہ بڑی محبت سے لکشمی بائی کو ماں کہہ کر پکارتا اور لکشمی بائی مہیش کا ہر کام بڑی خوشی خوشی کر دیا کرتی تھی۔

ایک صبح مہیش کو نہلانے کے لیے جب باتھ روم لے جایا گیا تھا وارڈ میں لکشمی بائی آئی تو میں نے مناسب موقع جان کر لکشمی بائی سے پوچھا کہ مہیش ہر ہفتے اپنے ماں باپ کو پابندی سے دو خطوط لکھواتا ہے لیکن میں نے مہیش کے ماں باپ کے خطوط آتے ہوئے نہیں دیکھے، کیا بات ہے؟

"بات! مہیش کی معذوری ہے۔" لکشمی بائی نے کہا، "جسمانی طور پر وہ اتنا خراب ہے کہ اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ کیلیپر اور بیساکھی سے چلنے کے لیے بھی کم از کم ہاتھوں میں طاقت چاہیے۔ سیدھا کھڑا رہنے کے لیے کمر میں طاقت چاہیے۔ اس بے چارے کی تو

کمر بھی ٹوٹی ہوئی ہے اور ہاتھ لولے ہیں۔"
"پھر اسے یہاں رکھنے کا مقصد کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
لکشمی بائی کو ہلکی سی ایسی ہنسی آئی جس میں طنز تھا۔ جیسے سماج کے بے ڈھنگے پن پر وہ ہنسی تھی۔ لکشمی بائی نے کہا۔
"ڈاکٹروں نے اس کے ماں باپ کو لکھا کہ وہ آئیں اور مہیش کو لے جائیں۔ اس بات کو دو برس ہو گئے۔ وہ لوگ نہیں آئے۔ کیوں کہ انھیں پتہ چل گیا کہ مہیش اچھا ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے اسے وہ اپنے خاندان میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسے وہ لوگ بوجھ سمجھتے ہیں کیوں کہ مستقبل میں کوئی اچھی امید خاندان کے لیے اس سے نہیں کی جا سکتی۔"
"او خدا" میرے منہ سے نکل گیا۔
"ہاں" لکشمی بائی نے کہا۔ "جب مستقبل کی کوئی امید نہیں رہتی ہے تو خونی رشتے بھی اپنے خون کو سفید کر دیتے ہیں لیکن مہیش کو بڑی آس لگی ہوئی ہے۔ وہ ہر روز اُن کے آنے کا انتظار کرتا ہے۔ لیٹنے کے بعد وہ بیٹھتا ہے تو محض کھڑکی میں سے اس لمبی سڑک پر اپنی آنکھوں سے تلاش کرنے کے لیے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس راستے پر اسے اس کے ماں باپ، بھائی، بھابی، سدھا اور رمیش نظر آئیں گے اور وہ خوشی سے پھولا نہ سمائے گا۔ وہ انھیں کھڑکی میں سے پکارے گا۔"
"ہو سکتا ہے کہ اس کے ماں باپ کو ڈاکٹر کا خط نہ ملا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ مہیش کے پتاجی کا پتہ بدل گیا ہو۔"
"ایسا نہیں ہے" لکشمی بائی نے اعتماد سے کہا۔ "ابھی چار مہینے پہلے ہسپتال کے سکریٹری نے اپنے ذاتی خرچ سے ایک آدمی کو مہیش کے شہر کو بھیجا تھا۔ ان لوگوں نے کہہ دیا کہ مہیش کی نگہداشت کرنے کے لیے ان کے ہاں نہ جگہ ہے اور نہ زائد آدمی۔ اس لیے انھوں نے صلاح دی کہ اسے بمبئی کے کسی معذوروں کے ہوم میں داخل کر دیں۔ وہاں اس کو ایسے لوگوں کی دل داری بھی مل جائے گی جن کے مسائل ایک جیسے ہیں اور

نگہداشت بھی ہو جائے گی۔ دیکھنا ہے کہ اب ڈاکٹر اور انتظامیہ کے لوگ اس سلسلے میں کیا کرتے ہیں؟"

اچانک وھیل چیئر نظر آئی جس پر مہیش کو وارڈ بوائے لا رہا تھا۔لکشمی بائی نے خاموش ہو جانے کے لیے کہا کیوں کہ ایسی باتیں سُن کر مہیش کو دکھ ہوگا۔لکشمی بائی کے کہنے کے مطابق کسی نے بھی یہ باتیں مہیش کو نہیں بتائیں۔ اس لیے مجھے بھی خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ میں نے اقرار کر لیا کہ ایسی باتیں میں بھی مہیش سے نہیں کروں گا۔

مہیش کا پلنگ وارڈ کے کونے میں تھا۔ اس طرح اس کے پلنگ کے اطراف دو کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ ایک سائیڈ کی دیوار کے باہر کھلنے والی کھڑکی تھی اور دوسری سرہانے کی دیوار کی کھڑکی تھی۔ ان دو کھڑکیوں میں سے باہر کے دو رُخ دور دور تک نظر آتے تھے۔

ایک رات جب کہ وہ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی میری نیند اچانک ٹوٹ گئی۔ میں نے دیکھا کہ مہیش جو چت لیٹا ہوا تھا، اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بار بار وہ ذرا سا ٹیڑھا ہوتا، سر اُٹھاتا، آدھا اُٹھ جاتا لیکن اس کے بعد ہی کمر میں قوت نہ ہونے کی وجہ سے گر جاتا۔ اس نے متعدد بار کوشش کی اور ہر بار گرتا گیا۔ آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے اس کا سر پلنگ کی ریلنگ کے قریب آ گیا۔ ریلنگ کے ہینڈل میں اس نے اپنے سر کو پھنسایا اور زور لگا کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں پلستر میں ہونے کی وجہ سے اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا اور ساتھ ہی دیکھنا بھی چاہتا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ بیٹھنے کے بعد اپنے سر سے ٹھوکر مار کر اس نے کھڑکی کے پٹ کھولے جو سرد ہواؤں سے بچانے کے لیے بند کر دیئے گئے تھے۔ جوں ہی کھڑکی کے پٹ کھلے سرد ہواؤں کے جھونکوں کے ساتھ باہر چھٹکی ہوئی چاندنی بھی جگ مگ کرتی ہوئی مہیش کے پلنگ پر آ گئی۔ مہیش چاندنی میں تھا۔ وہ مسلسل پورے چاند کو دیکھتا جا رہا تھا۔ کھڑکی کی سلاخ پر اس نے اپنے سر کو ٹکا دیا۔ اُس کی آنکھیں چاند کی طرف تھیں۔

بہت دیر تک مہیش کو اس حالت میں دیکھ لینے کے بعد میں نے اسے آہستہ سے

پکارا اور پھر پوچھا کہ وہ سلاخ پر سر ٹکا کر سو تو نہیں رہا ہے۔

"نہیں" جہیش نے جواب دیا۔ "اپنے آپ کو گم کر کے آسمان اور چاند کو پا لیتا ہوں تو بڑا مزہ آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میلوں پھیلا ہوا نیلا نیلا سمندر ہے اور چاند ایک بڑی سی خوب صورت اور سجائی ہوئی کشتی ہے جو جگ مگ کر رہی ہے۔ وہ چاند میں جو سائے نظر آ رہے ہیں تا' ان میں مَیں ہوں۔ میرے باز و ماتا جی ہیں۔ ان کی گود میں میرا سر ہے۔ وہ میرے سر کو سہلا رہی ہیں۔ کشتی کے کھلے حصے میں سدھا رقص کر رہی ہے۔ اسے رقص سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ان تین سالوں میں وہ بڑی ہوگئی ہوگی۔ بھابی نے اسے رقص سکھایا ہوگا۔ رمیش کو چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی چڑیاں پالنے کا شوق ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے اپنے ساتھ چڑیوں کا پنجرہ بھی اٹھا لیتا ہے۔ میں نے جب گھر چھوڑا تھا اس کے ہاں چار پنچھی تھے۔ ایک جوڑے نے انڈے بھی دیئے تھے۔ اب رمیش کے پاس کم از کم دو درجن چڑیاں تو ہوں گی ہی۔ بھانت بھانت کے رنگوں والی چڑیاں بڑی اچھی لگتی ہیں۔ معلوم نہیں اس نے اب بڑا پنجرہ خرید لیا ہے یا پنجروں کی تعداد بھی بڑھا لی ہے۔ میں اس کشتی میں بیٹھ کر اندازہ لگا رہا ہوں کہ حقیقت کیا ہے؟"

پونم کا چاند، نیلا آسمان، پھیلی ہوئی چاندنی اور دل خوش کن تصورات جہیش کی تفریح گاہیں تھیں۔ ان کے علاوہ جا بھی کہاں سکتا ہے۔ چاند کی سنہری کشتی میں بیٹھ کر حقیقتوں کو کھوجنا اس کی بے بسی کی دلیل بن جاتی تھی۔ لکشمی بائی جسے وہ پیار سے ماں کہہ کر شاید ماں کا نام اپنے ہونٹوں پر لانے کی خواہش کو پوری کر لیتا تھا، ہر ہفتے جہیش کے لیے پوسٹ کے لفافے اور کارڈ لا کر دیتی تھی جنھیں وہ میرے ہاتھ سے لکھوا کر اُن لوگوں کو روانہ کرتا رہا جنھوں نے اسے پیدا کیا اور پالا پوسا اور اُن کو بھی جنھوں نے بچپن میں ہمدردی کی۔ ساتھ ہی ان کا انتظار وہ ہر شام کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے کیا کرتا تھا۔

میرا پلستر کٹ گیا تو میں بھی بیٹھنے کے قابل ہوا۔ اکثر شام کو چار سے چھ بجے کے درمیان جب بہت سے ملاقاتی ہسپتال میں شریک لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھنے کے لیے

آتے، تب میں اور جہیش بڑے تنہا تنہا سے ہو جاتے تھے کیوں کہ ہم سے ملنے کے لیے کسی کے آنے کی اُمید نہیں رہتی تھی۔ اس تنہائی کے احساس کو ختم کرنے کے لیے میں اکثر شاموں میں جہیش کے پلنگ پر ہی چلا جاتا تھا اور کھڑکی کے باہر ہم دونوں ہسپتال کی طرف آنے اور واپس جانے والوں کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر اکثر جہیش دور سے نظر آتے ہوئے لوگوں میں اپنے باپ، ماں، بھائی، بہن اور بھابی کی شباہتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مجھ سے روشناس کرواتا تھا۔

"دیکھو اصغر وہ لڑکی سدھا کے انداز میں چل رہی ہے۔"

"اس عورت کے بال بالکل بھابی کے بالوں کی طرح گھنے اور پھیلے ہوئے ہیں۔"

"میرے بڑے بھائی کی پیشانی اس آدمی کی پیشانی کی طرح گول ہے۔"

"ارے دیکھو تو سہی وہ عورت جو اپنی ساڑھی کا پلّو اوڑھے ہوئے ہے، سائیڈ سے میری ماں جیسی لگتی ہے۔"

جہیش کی ایسی باتیں بارہا سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میں کہیں اس کے ماں باپ بھائی یا بھابی کو دیکھ لوں گا تو انھیں پہچاننے میں مجھے دیر نہیں لگے گی۔

ایک کے بعد ایک میرے تینوں آپریشن کامیاب ہو گئے۔ میرے پاؤں کی ہڈیاں جو ٹیڑھی نشوونما پا رہی تھیں درست کر لی گئیں لیکن پاؤں کی طاقت جو زائل ہو چکی تھی وہ واپس نہیں آئی اس لیے مجھے کھڑا کرنے کے لیے کیالیپر اور بیساکھیوں کے آرڈر دیئے گئے تھے۔

اچانک آدھی رات کے قریب ایک بار میری نیند اُچاٹ ہو گئی۔ جہیش کراہ رہا تھا۔ اس کراہٹ میں بڑی تڑپ تھی۔ میں اُٹھ کر بولا۔

"سسٹر کو پکاروں کیا جہیش؟"

"چھاتی میں عجیب سا درد ہو رہا ہے۔ لیکن تم سسٹر کو پکارو گے تو آس پاس سونے والے بچوں کی نیند خراب ہو جائے گی۔"

"میں اگر کچھ کر سکتا ہوں تو بتاؤ۔"

کراہتا ہوا مہیش بولا۔

"میرے کبورڈ میں پلاسٹک کی سفید ڈبی ہے۔ اس میں گولیاں ہوں گی، ایک گولی اس میں سے دے دو اور پانی بھی۔ خود ہی درد کم ہو جائے گا۔"

اپنے پلنگ کے کنارے پر ایک ہاتھ کا وزن اور مہیش کے پلنگ کے کنارے پر دوسرے ہاتھ کا وزن ڈال کر میں نے اپنے بدن کا جھول لیا اور مہیش کے پلنگ پر چلا گیا۔ مہیش کے پلنگ کے بازو اس کا کبورڈ تھا۔ جھک کر میں نے کبورڈ کھولا اور پلاسٹک کی سفید ڈبی میں سے ایک گولی نکال کر اوپر رکھی اور اس کا خالی گلاس لے کر میں پلنگ سے نیچے اُتر کر فرش پر بیٹھ گیا۔ فرش پر لمبے رکھے ہوئے پاؤں اور جسم کو ہاتھوں کے بل آگے کھسکاتے ہوئے میں حمام میں جا کر نل سے پانی لے آیا اور مہیش کو اپنے ہاتھوں کے سہارے سے بٹھایا۔ اس کے منھ میں گولی رکھ کر پانی کے گھونٹ پلائے۔ شاید بیٹھ جانے کی وجہ سے اس کے درد میں فرق پڑ گیا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ پسینے کی بوندوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"تھوڑے دنوں کے بعد تمھارا کیالیپر اور کرچس آجائیں گے اور تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ گے۔"

میں نے اپنے اندر بہت زیادہ خوشی کا احساس کیا۔ وجہ یہ ہے کہ چودہ برس پہلے جب مجھ پر پولیو کا حملہ ہوا تھا میری عمر دو برس کی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت مجھے کسی بات کا شعور نہیں تھا۔

"جب پہلی بار اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ گے تو محسوس کرو گے کہ تم بہت اونچے اُٹھ گئے ہو اور سارا ماحول تمھیں جھکا ہوا لگے گا۔"

"ایک دن تم بھی اپنے ماحول کو جھکا دو گے۔"

میں نے مہیش کو دلاسہ دیا۔ لیکن مہیش نے میری بات اُڑا دی اور بولا۔

"میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ جب بہت زیادہ درد ہوتا ہے تو خود بخود بھگوان اور ماں بہت یاد آتے ہیں۔ اصغر! وہ دیکھو اتنی دور حاجی علی بابا کی درگاہ کے سامنے

سے ایک ٹرک جا رہا ہے لیکن اس کی سنسناہٹ یہاں تک آ رہی ہے۔ اسی طرح سے میں جو اپنے لوگوں کو یاد کر رہا ہوں تو انھیں بھی ضرور پتہ چل رہا ہوگا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ لوگ جلد آئیں گے۔"

"میں اگلے خط میں لکھ دوں گا کہ تم نے درد کی حالت میں انھیں بہت یاد کیا تھا۔" میں نے کہا۔

پندرہ دن بعد پھر مہیش کو رات میں ایسا ہی درد اُٹھا۔ شاید اس سے بھی زیادہ کیوں کہ وہ اتنا زیادہ تڑپ رہا تھا کہ بات بھی اس کے منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔

میں اس کے پلنگ پر چلا گیا اور بازو کی کھڑکی کے پٹ کھولے تو اچانک پورے چاند کی روشنی مہیش کے چہرے پر پڑی۔ وہ چاند کی طرف دیکھ رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ مہیش کا چہرہ پسینے کے ریلوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں سسٹر کو پکارنا چاہتا تھا لیکن مہیش نے روکتے ہوئے کہا۔

"مت پکارو اصغر! میں برداشت کر لوں گا۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میرے ہسپتال کے اخراجات میرے پتاجی نہیں بھیج رہے ہیں۔ اب اس درد کی بات بتا کر میں کیسے دوا لوں۔"

پھر وہ چاند کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب اس کشتی میں میں اکیلا ہی سفر کروں گا اور کہیں بھگوان نظر آئیں تو انھیں ہاتھ جوڑ کر کہوں گا کہ لوگوں میں اتنی بے حساب معذوری بانٹنے سے پہلے بھگوان اسے قابو میں رکھنے کے بھی سامان کرو۔"

کراہ کر کہتے کہتے وہ بے ہوش ہونے لگا۔ میں نے زور سے سسٹر کو دو تین بار آواز دی۔ دور سے ٹارچ کا حلقہ بڑھتا ہوا نظر آیا۔ رات کی خاموشی میں اونچی ایڑی کی سینڈل سے چلنے کی مخصوص ٹک ٹک واضح ہوتی گئی۔ وارڈ میں روشنی ہوئی۔ وارڈ بوائز ڈاکٹروں کے لیے بھاگے۔ مہیش کو ٹرالی پر ڈال کر اسپیشل وارڈ میں لے جایا گیا۔

اچانک تازہ اخبار میرے سامنے آگیا ہے۔ سامنے کے صفحے پر بڑی سطروں میں اطلاع ہے کہ اقوام متحدہ کی پاس کی ہوئی قرارداد کے مطابق ۱۹۸۱ء معذور افراد کے لیے بطور بین الاقوامی سال منایا جائے گا، اس قرارداد کا موضوع پورے مواقع اور مساوات ہے۔

اتنے برسوں کے بعد مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جن حلیوں، خدوخال اور انداز کی نشان دہی جہیش نے کی تھی وہ لوگ اخبار کے ذریعے جہیش کی موت کی تردید کر رہے ہیں۔ جہیش کے لیے اب اپنی چاہت کا اعلان کر رہے ہیں۔ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟؟

کھلا ہوا دروازہ

فون کی گھنٹی بجی تو الوما نے اسے اٹھایا۔ 'ہلو' کا لفظ ادا کرنے کے بعد بولی۔

"میں الوما ہائی لینڈ ہوں۔ آپ نے درست نمبر ملایا۔ یہ شہر ونی پیگ ہی ہے۔ البرٹ میرے شوہر ہیں۔ وہ اس وقت گھر میں ضرور ہیں لیکن موسم اچھا ہونے کی وجہ سے بیک یارڈ میں بڑھتی ہوئی ہریالی کو کاٹ رہے ہیں۔ میں ان کو یقیناً بلا سکتی ہوں لیکن میرے وہاں جانے اور ان کے یہاں آنے تک کافی دیر ہو جائے گی۔ آپ نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ آپ ٹورنٹو سے فون کر رہے ہیں۔ یہ تو طویل فاصلے کا فون ہے۔ اس لیے یوں کیجیے گا کہ آپ اپنا نمبر مجھے دے دیں۔ میں پندرہ بیس منٹ کے اندر البرٹ کے ساتھ آپ کی بات کروا دوں گی۔ دوسرے لمحے الوما کاغذ پر اس طویل فاصلے کے نمبر کو نوٹ کر رہی تھی۔

البرٹ ہائی لینڈ کا گھر اچھا خاصا بڑا تھا۔ یہ بڑا گھر دراصل اس کے لیے وقت کی اہم ضرورت تھا۔ البرٹ اور الوما شادیاں کرنے اور اپنی شادیوں کے بعد طلاق حاصل کرنے میں تجربے کار ہو گئے تھے۔ ان تجربات ہی کے کرشمے تھے کہ ان کی پچھلی بیویوں اور پچھلے شوہروں کے تعلقات سے جو اولاد ہوئی تھی، وہ بڑی تعداد میں تھی۔

البرٹ، الوما کا چوتھا شوہر تھا۔ اور الوما البرٹ کی پانچویں بیوی تھی۔

البرٹ اکثر مذاق میں گھر میں آئے ہوئے اپنے مہمانوں سے کہا کرتا تھا کہ ازدواجی

معاملات میں وہ الوما سے پچیس فی صد زیادہ تجربہ رکھتا ہے۔ الوما کے پہلے شوہر کی دو لڑکیاں ٹینا اور مارتھا اپنی ماں الوما کے ساتھ رہنے کے لیے آگئی تھیں۔ الوما کے دوسرے شوہروں کی اولاد اور البرٹ کی پچھلی بیویوں کے بچے اپنے والدین سے ملنے کے لیے کرسمس اور ایسٹر میں خصوصی طور پر اور نارتھ امریکہ میں منائے جانے والے یوم مادر اور یوم پدر اور ایسے ہی دوسرے مواقع پر اکثر و بیشتر آجاتے تھے۔ اس لیے ایک بڑا گھر البرٹ کے لیے ضروری تھا۔

ڈرائنگ روم میں صوفوں کے سامنے دیوار پر خوب صورت سنہری فریم کے درمیان ایک افغان ہاؤنڈ کی خوبصورت پینٹنگ تھی۔ الوما کی بڑی لڑکی مارتھا کے بوائے فرینڈ رانڈی نے خصوصی کوشش کے ساتھ ونی پیگ کے ایک نامور ہندوستانی آرٹسٹ نیگورام کو اس بات کے لیے آمادہ کر لیا تھا کہ وہ ساڑھے تین ہزار ڈالر کی معمولی رقم لے کر ان کے گم شدہ کتے کا پورٹریٹ بنائے جو ہو بہو اصل ٹامی کے قدوقامت کے مطابق ہو۔ افغان ہاؤنڈ کی سائز، اونچائی اور جسامت وغیرہ کے اعداد و شمار خاندان کے افراد کے ہاں تھے۔ بہت سی رنگ برنگی تصویریں اور ویڈیو بھی تھے۔ انھیں دیکھ کر دو ہفتوں کے اندر نیگورام نے پورٹریٹ بنا دیا۔ رنگوں کی اچھی آمیزش کے ساتھ اس آرٹسٹ نے پورٹریٹ کو اصل ٹامی سے بھی زیادہ خوب صورت اور جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ دور سے یوں لگتا تھا جیسے سنہری چوکھٹ کی کھڑکی میں ایک حقیقی ٹامی کھڑا ہوا ہے جو ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے افراد کو تاک رہا ہے۔ اب کسی لمحے ٹامی وہاں سے جست لگا کر سب کے درمیان دھم سے آجائے گا تاکہ ایک کے بعد تمام افراد کے ہاتھوں کے ذریعے اپنے جسم کو سہلوائے جانے کے سرور کو وہ حاصل کر سکے۔

پورٹریٹ کے نیچے الوما کی چھوٹی بیٹی ٹینا نے ایک نوٹ لکھ کر لگا دیا تھا۔

"پیارے ٹامی! جہاں کہیں بھی ہو لوٹ کر گھر آجاؤ۔ دیکھو تمھارے بغیر ہمارا یہ بڑا گھر ویران سا ہو گیا ہے۔ ہم سب کی آنکھیں تمھیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔"

ٹینا کے اس نوٹ کے بازو، ٹینا کے بوائے فرینڈ رالف نے انگریزی شاعری

کی دو لائن لکھی تھیں جس کا مطلب یوں تھا" میں فضا بن کر، ہوا بن کر، خوشبو بن کر، گھٹا بن کر کبھی کسی وقت اچانک آجاؤں گا، تم اپنے گھر کا دروازہ میرے لیے کھلا رکھنا"۔

نارتھ امریکہ میں ٹیلی فون بھی ایک کھلا ہوا دروازہ ہے۔ ابھی ابھی الوما نے اس دروازے میں سے ٹامی کے لوٹ کر آنے کی چاپ سُنی تھی۔ جانوروں کے دوست نام کی انجمن، یعنی کہ فرینڈس آف دی اینی مل سوسائٹی، ٹورنٹو کے دفتر سے ان کے ایک سربراہ نے فون کیا تھا۔ الوما نے البرٹ کو اطلاع دی۔ بیک یارڈ سے آکر البرٹ نے نمبر ملایا اور باتیں کرنے لگا" ہاں! ہم لوگ کوئی دو مہینے قبل اپنے موٹر ہوم کے ذریعے تین ہفتوں کی سیر و تفریح کے لیے نکلے تھے۔ نیاگرا فال دیکھنے کے بعد ہم ٹورنٹو میں بھی ٹھہرے تھے۔ ہمارا کتا ٹامی ہمارے ساتھ تھا۔ شہر کی سیر و تفریح کرنے کے بعد جب ہم تھک گئے تو دوپہر میں ہائی وے نمبر چار سو ایک اور ڈان وادی کے نزدیک ایک چھوٹا پارک جو نظر آیا تھا، وہاں پر کھانے کے لیے رک گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے درختوں کے جھنڈ میں ہریالی کے اوپر لوٹتے رہے۔ ٹامی میری لڑکیوں کے ساتھ تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر دوڑتا رہا۔ اتنی کھلی ہوئی جگہ میں وہ خوشی کے مارے اچھل رہا تھا۔ جب دیر ہوگئی اور وہ نظر نہیں آیا تو میری لڑکیوں نے یہ فرض کر لیا کہ وہ میرے ساتھ ہوگا۔ میں دراصل اپنی موٹر ہوم میں تھا اور میری آنکھ لگ گئی تھی۔ وہاں سے نکلنے کی تیاری شروع ہوئی، تب احساس ہوا کہ ٹامی نہیں ہے۔ ہم نے اسے بہت ڈھونڈا، تمام سمتوں میں جا کر پکارا، سیٹیاں بجائیں لیکن وہ نہیں آیا۔ رات بڑھتی جا رہی تھی۔ تھک ہار کر ناامید ہوگئے۔ آخر کار پولیس میں ہمیں رپورٹ لکھوانی پڑی۔ بے بس ہو کر وہاں سے نکل گئے"۔

بہت دیر تک البرٹ فون پر اس سربراہ کی باتیں سُنتا رہا اور اس کے بعد بولا" آپ نے مناسب قدم اٹھایا ہے۔ اس کی اچھی صحت اور اچھی غذا و رہائش کے لیے آپ نے خصوصی توجہ دی۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ میں اور میرے خاندان کے تمام افراد آپ کے ممنون ہیں۔ آپ قطعی فکر نہ کریں۔ میں تمام اخراجات کے بِل

چکا دوں گا۔ ٹھہریئے، میں ان رقومات کو نوٹ کرنا چاہوں گا۔"
الوما نے جھپٹ کر کاغذ اور قلم اُٹھایا اور البرٹ کے آگے رکھ دیا۔ سیدھے ہاتھ میں فون تھامے اور بائیں ہاتھ میں قلم لے کر البرٹ نوٹ کرنے لگا۔
"جانوروں کے خلاف کی جانے والی بے رحمی کو روکنے والی انجمن کی جانب سے جرمانہ پانچ سو ڈالر۔ ٹامی کی پھیلائی ہوئی غلاظت پر جرمانہ اور اس غلاظت کو صاف کرنے کے لیے ٹورنٹو میونسپل کارپوریشن کو دی ہوئی رقم، تین سو بیس ڈالر۔ تین ہفتوں کے لیے ٹامی کی غذائیں نگرانی اور ڈاکٹر کی فیس، تین سو ڈالر۔ جملہ ایک ہزار ایک سو بیس ڈالر۔"
ٹامی کا کھوج مل جانے کی خبر آندھی کی طرح پھیلی۔ مارتھا نے اپنے کمرے میں سے اپنے بوائے فرینڈ رانڈی کو فون کیا اور یہ اطلاع دی۔ آناً فاناً رانڈی نے اپنا ارادہ بتا دیا کہ وہ ٹامی کی گمشدگی اور واپسی پر ایک چھوٹا فیچر فلم بنائے گا۔ اسے فیچر فلم بنانے کا بڑا سلیقہ تھا۔ اس کی بنائی ہوئی ایسی چند فلمیں ٹی۔ وی پر بھی دکھائی گئی تھیں۔ اس کا تعلق ونی پیگ کے روزنامہ "ونی پیگ ٹائمز" کے ادارے سے تھا۔ اس لیے اندازہ لگایا جا رہا تھا کہ اخبار کے نامہ نگار ایرپورٹ پر اور البرٹ کے گھر پر بھی رانڈی کے ہلکے سے اشارے پر چلے آئیں گے۔ البرٹ اور الوما نے اپنے اپنے بچوں کو فون پر ٹامی کی واپسی کی بات بتائی۔ ان کے بچے ٹامی سے مانوس تھے۔ انھوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ ٹامی کی واپسی کی اس تقریب میں وہ ضرور شرکت کریں گے۔

دوسرے دن ہفتہ تھا۔ "جانوروں کے دوست" نام کی انجمن کے دفتر کو کھلا رکھا گیا تھا۔ اس لیے البرٹ نے ونی پیگ سے ٹورنٹو جانے اور لوٹ کر آنے کا ٹکٹ بک کیا۔ صبح میں روانہ ہو کر شام کو واپس آنے کا پروگرام بنا۔ ٹامی کی واپسی کے لیے بھی ہوائی جہاز کا ایک طرفہ راستے کا ٹکٹ خرید لیا گیا۔
صبح جب البرٹ ایرپورٹ کے لیے نکل رہا تھا، ٹینا اور مارتھا یہ سوچ کر اسے بڑے رشک سے دیکھ رہی تھیں کہ ان کے ڈیڈ بڑے نصیب والے ہیں۔ کیونکہ ٹامی کا

پتہ چلنے کے بعد سب سے پہلے وہی اسے دیکھیں گے، سب سے پہلے ٹامی ان کے لیے ہی خوشی کے مارے اپنی دُم کو خوب ہلائے گا اور ان کے ہاتھوں میں سما جائے گا۔ ٹامی کی گردن، سر اور پیٹھ پر ڈیڈ ہی سب سے پہلے خوب تھپکیاں دیں گے۔

البرٹ کے گھر سے نکل جانے کے بعد ٹینا اور مارتھا کا اصرار تھا کہ گھر کی نچلی منزل کے ایک چھوٹے کمرے میں جو ٹامی کا لکڑی کا گھر ہے، اس کے اندر بچھی ہوئی توشک کو بدل دیا جانا چاہیئے۔ آٹھ ہفتوں سے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ اس لیے توشک پر یقینی طور سے بہت سی گرد جمع ہو گئی ہوگی۔ وہاں اس کمرے میں کوئی روشن دان نہ ہونے کے باعث عین ممکن ہے کہ کسی قسم کی بدبو بھی پیدا ہو گئی ہوگی جو ٹامی کو نہیں پسند آسکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جانوروں کے دوست نام کی انجمن کا مہمان بنا رہنے کی وجہ سے ٹامی کے مزاج میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہو۔ ایسی صورت میں یہ پرانی توشک اسے بڑی گراں لگے گی۔ الوما نے یہ بھی سوچا کہ جب ٹامی کی توشک بدل ہی رہی ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ان جالی دار برتنوں کو بھی بدل دیا جائے جو ٹامی کے غذا کے ہاضمے کے بعد اس کی جسمانی ضرورت کے اخراج سے فراغت پانے کے لیے ایک الگ گوشے میں دور رکھے گئے تھے۔ الوما نے ٹامی کے غذاؤں کی بھی فہرست بنائی۔ پروٹین کے بسکٹ، نیم گرم دودھ میں ملا کر دلیا بنانے کا سفوف، چیونگ گم کے اجزا سے بنی ہوئی ہڈی کی ساخت جو کہ ٹامی کو بہت مرغوب ہے۔ ٹینا نے یاد دلایا کہ ٹامی کے ناخن کاٹنے پڑیں گے اس لیے کتوں کا مخصوص نیل کٹر بھی خریدا جائے۔ ٹامی کے دانتوں پر اگر ان لوگوں نے توجہ نہیں دی ہوگی تو اس کے منہ سے بدبو آرہی ہوگی، اس لیے کوئی اسٹرانگ ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ برش، کان صاف کرنے کے لیے سروں پر روئی لگی ہوئی تیلیاں بھی فہرست میں شامل کر دی گئیں۔ تب وہ ان چیزوں کو خریدنے کے لیے گھر سے نکل گئی۔

ملک کے اندر اڑان لینے والے مقامی جہاز اپنی آمد و رفت میں عموماً وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ ٹامی کی گردن کے اطراف رجسٹریشن کے نمبر کا پٹّا لگا ہوا تھا۔

بلیے تسمے کا ایک سرا اس پٹے کے ایک ہُک میں اٹکا ہوا تھا۔ دوسرا سرا البرٹ کے ہاتھ میں تھا۔

جوں ہی البرٹ ایرپورٹ کی راہداری میں آیا، رالف اس کے روبرو آگیا اور بولا " ڈیڈ! کیمرے کی طرف دیکھیے اور مسکرائیے۔ ایسی مسکراہٹ ہونی چاہیے جو کامیابی و فتح کا پرچم بن کر نظر آئے۔"

" ونی پیگ ٹائمز" کے رپورٹر نے بھی تصویریں لیں اور پوچھا کہ ٹامی کے بارے میں البرٹ کی موجودہ رائے کیا ہے۔ البرٹ نے بڑی مسرت کے ساتھ ٹامی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا " بڑا وفادار دوست ہے۔ ٹورنٹو میں جانوروں کے دوست نامی انجمن کے سربراہ نے بتایا کہ ان کی تحویل میں آنے سے قبل یہ ہر روز شہر کی شاہراہ پر جاتا تھا اور ایک محفوظ مقام پر کھڑا ہو کر گزرنے والی گاڑیوں کو تاکتا رہتا تھا۔ اس امید پر کہ اس کو وہ گاڑی نظر آجائے گی جس کے ذریعے یہ ونی پیگ سے ٹورنٹو آیا تھا۔ بہت سے راہروؤں نے پولیس کو فون کیا اور پولیس نے اس انجمن کو اطلاع دی تاکہ انجمن ٹامی کو اپنی پناہ میں لے سکے اور اس کے بعد اس کے مالک کو تلاش کرے۔"

کسی قدر فاصلے پر الوما، ٹینا اور مارتھا کھڑے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا ٹامی ان کو اتنے دنوں بعد بھی پہچان لے گا۔ وہ تینوں زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے تاکہ ٹامی انھیں آسانی کے ساتھ دیکھ سکے۔ ٹامی نے الوما کو دیکھا اور دم ہلاتا ہوا لپکا۔ البرٹ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تسمے کا کنارا چھوڑ دیا۔ ٹامی الوما کے روبرو تھا۔ اپنے جسم، سر اور دم کو بار بار ہلا کر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ الوما نے اس کی پیٹھ کے اطراف اپنے ہاتھ ڈالے۔ اب ٹامی دُم ہلاتا ہوا پچھلے دو پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اگلے دو پاؤں الوما کے کندھے کے قریب تھے۔ الوما نے اپنے ہاتھوں کو بھینچ کر ٹامی کو زیادہ قریب کر لیا۔ ٹامی نے منہ میں سے زبان نکالی اور الوما کے گال کو چاٹا۔ الوما کے بعد جب مارتھا اور ٹینا نے اسے اپنی جانب کھینچ کر اپنی چاہت کا اظہار کیا تو ٹامی نے بھی ان کے گالوں کو اپنی زبان لگا کر اپنی چاہت بتائی۔ مارتھا نے اپنے دونوں

ہاتھوں سے اس کے نتھنوں کو پکڑا، اس کا منہ بند کیا۔ اس کی زبان اندر چلی گئی۔ تب مارتھا نے ٹامی کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹوں کو ذرا سا چھوا اور چھوڑ دیا۔

گھر پہنچے تو الوما کے پچھلے شوہروں کے بچے، البرٹ کی سابقہ بیویوں کے بچے اور پڑوس کے گھروں کے بچے بڑی تعداد میں گھر کے باہر راہداری میں اور لان کے اوپر قطار در قطار جھومتے رقص کرتے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بانس کے ڈنڈے تھے۔ ان بمبوؤں کے اوپری سروں پر مستطیل نما سفید بینر بندھے تھے جن پر ٹامی کے لیے مختلف اقسام کے مکمل اور نامکمل نعرے لکھے گئے تھے۔

"خوش آمدید ٹامی!"

"ٹامی ——— ہمارا پیارا دوست"

"ٹامی کے بغیر گھر کا ماحول ——— سونا سونا"

"گھر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں ——— آجاؤ ٹامی"

"ٹامی اور گھر کی خوشیاں ——— ایک ہی بات"

ٹامی کی واپسی پر بنائی ہوئی فیچر فلم "کھلا ہوا دروازہ" امریکن وزارت خارجہ کے شعبۂ عوامی تعلقات کو پسند آگئی۔ اس شعبے کی جانب سے فیچر فلم کے جملہ بیرونی حقوق کو خرید لیا گیا۔ اس فلم کی کاپیاں غریب ممالک میں کھولی ہوئی لائبریریوں میں پہنچا دی گئیں۔ ان ممالک کے ٹی۔ وی اسٹیشنوں کو یہ کاپیاں بطور تحفہ بھی روانہ کر دی گئیں۔

"کھلا ہوا دروازہ" فیچر فلم ٹی۔ وی پر آگئی۔ گھر کے ڈرائنگ روم کے صوفوں پر معزز لوگ اور ان کے بچے آرام سے بیٹھ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک ڈرائنگ روم کے باہر ورانڈے کے فرش پر بیٹھ کر رامو بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ رامو کے ماں باپ نہیں تھے۔ وہ اس کے بچپن میں مر گئے تھے۔ اس لیے رامو اسکول جاری نہیں رکھ سکا۔ فیس کے پیسے اور پہننے کے لیے اجلے کپڑے کہاں سے لاتا۔ لوگوں کے گھروں میں جھوٹے برتن دھو دھلا کر رکھنے، کپڑے دھوتے اور گھر کے اندر صاف صفائی کرنے کی نوکری اس نے

قبول کر لی تھی۔ اس کام کے معاوضے میں وہ دو وقت کا کھانا کھا لیتا تھا اور دوسرے اخراجات کے لیے تھوڑے روپے اکٹھے ہو جاتے تھے۔ وراندے کے نیچے آنگن تھا اور آنگن میں باہر جانے کا دروازہ کھلتا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک کتّا دبے پاؤں بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ اندر آ گیا۔ رامو کو دیکھ کر وہ دُم ہلانے لگا۔ پھر آنگن میں سے گزر کر وراندے کی سیڑھیوں کے پاس آ گیا۔ جس طرح رامو کو علم تھا کہ وہ وراندے کی حدود کو پار کر کے ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھ سکتا، اسی طرح ٹائیگر کو بھی احساس تھا کہ وہ آنگن کو پھلانگ کر وراندے کی سیڑھی پر نہیں جا سکتا۔ صرف سیڑھیوں کے قریب آکر آس بھری نظروں سے وہ رامو کو تاکتا تھا۔ کوئی دو تین ہفتے قبل رامو کی مالکن نے رامو کے کھانے پر شوربہ ڈالا تھا۔ شوربے میں گوشت کی بوٹیاں تو نہیں تھیں البتہ ہڈیاں رہ گئی تھیں جن ہڈیوں کو رامو چبا سکتا تھا انھیں اس نے چبایا اور جو نہیں چبا سکتا تھا انھیں اس نے گھر کے باہر ٹائیگر کے آگے رکھ دیا تھا۔ ٹائیگر نے بڑے مزے کے ساتھ دانتوں سے کڑم کڑم کی آوازیں نکالتے ہوئے انھیں کھا لیا تھا۔ تب سے ٹائیگر رامو کا دوست بن گیا تھا۔ ایک دن رامو کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر بھی آ گیا تھا۔ تب سے ٹائیگر کا یہ معمول بن گیا تھا کہ دن میں ایک آدھ بار وہ رامو سے ملنے چلا آتا۔ کبھی گھر کے اندر اور کبھی گھر کے باہر۔ دُم ہلا کر اپنی خاموش زبان میں پوچھ لیا کرتا ہے کہ دوست میرے لیے کیا آج تم نے کوئی ہڈی نہیں بچائی؟

ٹائیگر کو دیکھ کر رامو سٹ پٹا یا۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں اس کے مالکوں کو ٹائیگر کی ہر روز کی آمد پر کوئی اعتراض نہ ہو جائے۔ اس لیے اس نے اپنے ہاتھ کو کھول کر اس طرح سے ہلایا جس کا مطلب یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ نہیں میرے پاس تمھیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے دوست! دو بار ایسا اشارہ کرنے کے بعد رامو نے دوبارہ اپنے ہاتھ کو دوسری طرح سے حرکت میں لایا جس کا مطلب تھا کہ یہاں سے فوراً چلے جاؤ، جس راستے سے آئے ہو اُس پر اُلٹے پاؤں لوٹ جاؤ۔ ٹائیگر ان اشاروں کی زبان سمجھنے لگا تھا۔ اس لیے آنگن میں سے ہوتا ہوا باہر کے دروازے پر گیا اور سڑک

پر نکل گیا۔ بھوک تھی کہ بے طرح ستا رہی تھی۔ بھوک پیٹ کی زبان بن کر اب زیادہ شور کر رہی تھی تاکہ پیٹ کی تسکین کے لیے اس کے اندر جو چیز لائی جا سکتی ہے وہ جلد سے جلد لائی جائے۔ اس گلی میں پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر دوسرے گھر کا دروازہ تھا۔ وہ دروازہ بھی کھلا تھا۔ دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے ہو کر ٹائیگر نے اندر جھانکا۔ بڑا آنگن تھا۔ آنگن کے دوسری طرف کنارے پر پانی کا نل تھا۔ نل کے اطراف بنائے ہوئے منڈیر پر کھانے کے بعد کے نکلے ہوئے جھوٹے برتن صفائی کے لیے رکھے گئے تھے۔ ٹائیگر کو ذائقہ دار کھانے کی بو آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ ان برتنوں میں چوسنے اور چاٹنے کے بعد چھوڑی ہوئی ہڈیاں ہو سکتی ہیں۔ آنگن میں ٹائیگر کو کوئی نظر نہیں آیا۔ اس لیے دبے پاؤں وہ اندر گھس گیا۔

دفعتاً ایک زوردار آواز گونجی "میں نے تاکید کی تھی کہ باہر کا دروازہ بند رکھو۔ یہ دوسرا کتا ہے جو اب گھر میں گھس کر آ گیا۔ جس گھر میں کتے آتے ہیں وہاں ان کے ساتھ نحوست آ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے گھر میں برکت نہیں ہے۔"

در اصل برکت کا لفظ ایک طعنہ تھا جسے یہ ساٹھ سالہ آدمی اپنی ستائیس سالہ بیوی پر پچھلے پانچ سال سے تلوار کی مار کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ پانچ سال قبل شادی کی پہلی رات کو اس شوہر نے اپنی اس دلھن سے اولاد کی تمنا کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر لڑکا ہوگا تو اس کا نام برکت سنگھ رکھیں گے اور لڑکی ہوگی تو برکت کور۔"

پانچ سالوں میں برکت کا وجود عمل میں آیا ہی نہیں۔ ٹائیگر کو اپنے آنگن میں دیکھ کر وہ غصے میں پاگل ہو گیا۔ چند نوک دار پتھر پہلے سے تیار رکھے تھے۔ ایک نوک دار پتھر کو اٹھا کر نشانہ بنایا اور ہاتھ کے زوردار جھٹکے کے ساتھ پھینکا۔ پتھر ٹائیگر کی گردن پر پڑا۔ وہاں زخم ہو گیا۔ ٹائیگر تڑپا اور کوں کوں کرتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ کھلے ہوئے دروازے پر دوڑ کر پہنچنے سے قبل اس آدمی نے اسی طاقت سے دوسرا پتھر پھینکا۔ یہ نشانہ بھی خطا نہیں ہوا۔ یہ ٹائیگر کی ران پر لگا۔ وہاں بھی ایک زخم کھلا۔ کوں کوں

کی آواز مسلسل آتی رہی۔

آدمی فخر کر رہا تھا کہ اس کا نشانہ ہمیشہ ٹھیک بیٹھتا ہے۔ عورت محسوس کر رہی تھی کہ وہ کوں کوں اس کے زخمی دل کی بھی آواز ہے۔

راموں نے ٹائیگر کے رونے کی آواز سُنی تو بے چین ہو کر فوراً گھر سے باہر آگیا۔ گلی کے اندر دونوں دو الگ الگ کھلے ہوئے دروازوں سے باہر آئے۔ رامو کے سامنے کھڑا ہوا ٹائیگر اپنے سر کو آسمان کی طرف اٹھا کر رو رہا تھا۔ رامو نے ٹائیگر کی گردن پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ہاتھ خون سے آلودہ ہوئے۔ رامو کو سمجھ میں آگیا کہ ٹائیگر کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ بھرائی آواز میں بولا۔

"میرے دوست! ہمارے شہر میں جانوروں کے دوست نام کی کوئی انجمن نہیں ہے۔ جہاں میں تمھیں لے جاسکوں۔ جانوروں کے خلاف بے رحمی کا برتاؤ کرنے والوں کو نہ کوئی سزا ملتی ہے اور نہ جرمانہ لگایا جاتا ہے۔ البتہ نزدیک میں ایک پولیس اسٹیشن ہے۔ آؤ وہاں چلتے ہیں اور اس ظلم کے خلاف اپنی شکایت لکھواتے ہیں۔"

پولیس اسٹیشن پر انسپکٹر نے رامو کی شکایت سُنی اور رامو کے پہلو میں کھڑے ہوئے ٹائیگر کو دیکھتے ہوئے بولا —— "زخم کھایا ہوا یہ کتا نہ صرف خارش زدہ ہو جائے گا بلکہ دیوانہ بھی بن جائے گا۔ دیوانے کتے کے کاٹنے سے فوبیا ہوتا ہے۔ پیٹ میں انجکشن لینے پڑتے ہیں۔ بہت تکلیف ہوتی ہے، سمجھا؟ —— اس لیے ......"

'اس لیے' کے بعد اپنا جملہ ختم کرنے سے قبل انسپکٹر نے تیزی کے ساتھ اپنے ڈریس میں لٹکائی ہوئی پستول نکالی اور ٹائیگر کو نشانہ بنا کر دفعتاً دو گولیاں داغ دیں —— ٹائیگر تڑپا —— تڑپتا رہا اور تڑپ کر مر گیا۔ تڑپا رامو بھی۔ اچانک پیش آئے ہوئے ان لمحات سے وہ سکتے میں آگیا۔

اب وہ پولیس اسٹیشن سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے۔ وہ محسوس

محسوس کر رہا ہے کہ ٹی۔وی پر لگائے گئے فیچر فلم میں سے ٹامی نکل کر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے اور مسلسل پوچھ رہا ہے۔

"میرا بھائی ٹائیگر کہاں ہے رامو؟ جب تو یہاں سے جا رہا تھا تو وہ تیرے ساتھ تھا۔ اب وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں ہے رامو؟"

ٹامی کے سوالوں سے بچنے کے لیے رامو تیز تیز قدم اٹھا رہا ہے۔ ٹامی کے قدموں میں بھی تیزی آ رہی ہے۔ اب ٹامی اس کے پیچھے ہی نہیں آگے بھی ہے۔ اس کے دائیں طرف ہے۔ بائیں طرف بھی ہے۔ سوالات ہر سمت سے آ رہے ہیں۔

"میرا بھائی ٹائیگر کہاں ہے رامو؟ ٹائیگر؟ ٹائیگر؟"

اب رامو دوڑ رہا ہے۔ اس پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا منہ کھل گیا۔ اس کے نوکیلے دانت نظر آ رہے ہیں۔ وہ کاٹے گا اس آدمی کو جس نے ٹائیگر پر پتھر اٹھائے تھے۔ اس کی دوڑ میں اب شدت کی تیزی آ رہی ہے۔ وہ دوڑ رہا ہے۔ وہ تیز دوڑ رہا ہے۔

ایک ہنسی بے تکی سی

اچانک صابرہ نے روزمیری کی ایک جھلک دیکھی۔

جگ مگ کرنے والے اس بڑے شاپنگ پلازا کی چمک دار، شفاف سیڑھیاں الیکٹرانک آلات سے لیس ہونے کی وجہ سے خود بخود اوپر چلی جا رہی تھیں۔ کرسمس کے لیے شاپنگ کرنے والوں کا ایک بڑا ہجوم تھا۔ بھیڑ تمام منزلوں کی دکانوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اوپری منزل پر جانے والے لوگ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے اور وہ اوپر کی جانب جانے لگتی۔ اوپر پہنچانے والی تمام سیڑھیوں پر لوگ گچھا گچھ بھرے ہوئے تھے۔ ان میں جوان، بوڑھے، بچے، کالے، گورے، سانولے، پیلے، ناٹے، چپٹے، غرض ہر وضع کے لوگ شامل تھے جو مختلف ملکوں سے آئے ہوئے امیگرنٹ معلوم ہو رہے تھے۔ کرسمس کے تیوہار کے موقع پر دنیا بھر کی اشیا، فروخت کرنے والی دکانوں کے بڑے بڑے پلازا، ملٹی کلچر کینیڈا کا عمدہ نقشہ پیش کرتے ہیں۔

صابرہ نیچے کھڑی تھی۔ اس چڑھتی ہوئی سیڑھی پر صابرہ نے روزمیری کو جاتے ہوئے دیکھا اور پہچان لیا۔ روزمیری کو پہچان لینے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کے بال سنہری تھے جو بڑی خوب صورتی سے ترشوائے جاتے تھے۔ یا یہ کہ وہ اس طرح چلتی تھی جیسے کوئی

رنگین پروں والی آزاد چڑیا پھدک رہی ہے۔ یا یہ کہ اس کے سنہری بال جو گردن کے گرد کندھے تک تراشیدہ تھے اُچھل اُچھل کر جھومتے تھے۔ روزمیری کی یاد ذہن میں رہ جانے کی وجہ یہ بھی نہیں تھی کہ جب صابرہ کینیڈا میں نئی نئی آئی ہوئی تھی اور اس نے ایک کمپنی میں کام کرنا شروع کر دیا تھا تو روزمیری اس کمپنی میں اس کی ساتھی تھی اور بارہا دونوں نے لنچ ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا۔

صابرہ کے ذہن پر روزمیری کی یاد ایک کندہ کیے ہوئے نقش کی طرح رہ جانے کی خاص وجہ دراصل روزمیری کی ایک طویل ہنسی تھی، جو صابرہ کے خیال میں بڑی بے تکی تھی۔ جب صابرہ نے اپنی ایک ذاتی بات روزمیری کو بتائی تھی تو صابرہ کی توقع کے خلاف روزمیری پر یہ ہنسی طاری ہو گئی تھی۔ ایسی ہنسی پر صابرہ کو جہاں حیرت ہوئی تھی، وہاں کسی قدر جھنجلاہٹ اور ندامت بھی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس ہنسی میں تمسخر کا پہلو نمایاں ہو رہا تھا۔ کیا صابرہ کی بتائی ہوئی وہ بات مذاق اڑائے جانے کے قابل تھی؟ کیا صابرہ نے کوئی کم عقلی کی بات کی تھی؟ کیا اس کی بات سے جہالت جھلک رہی تھی؟ ایسے بہت سے سوال رہ رہ کر صابرہ کے ذہن میں کئی دن تک سوئیاں چبھوتے رہے اور ان سوئیوں کی نوک پر روزمیری کی ہنسی شعلہ بن کر زندہ رہی۔

صابرہ کی زبان سے وہ بات ایک خاص پس منظر میں نکلی تھی۔ کیفے ٹیریا میں لنچ کے دوران روزمیری چہک چہک کر صابرہ کو ایک لڑکے ایلین کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ایلین کو دو بار ڈیٹ دینے کے بعد روزمیری نے اُسے بوائے فرینڈ کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ اب وہ اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر ایلین کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں رہنے کے خاکے بنا رہی تھی۔ ایلین کو بوائے فرینڈ کی حیثیت سے قبول کر لینے کی نمایاں وجہوں میں اس کا خوب رو، وجیہہ اور خوش مزاج ہونا اور رقص و موسیقی سے لگاؤ رکھنا شامل تھا۔ وہ ایلین کی ان خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔

صابرہ نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا "کیا تم ایلین سے شادی کر رہی ہو؟"
"ہو سکتا ہے کہ کر لوں۔" روزمیری کے لہجے میں قطعیت کا زور نہیں تھا۔ پھر کچھ رُک کر

بولی "ایمین کی اپنی مرضی پر بھی انحصار ہے۔ وہ بھی جلد باز نظر نہیں آتا۔ تین سال تک ضرور ساتھ رہیں گے۔ شادی اگر نہ ہوئی تو بھی کامن لا کی رو سے میں خود بخود اس کی بیوی تسلیم کر لی جاؤں گی۔"

نئی امیگرنٹ صابرہ کو روزمیری کی باتیں پہیلی جیسی لگیں۔ بغیر شادی کیے ساتھ میں رہیں گے! یوں ہی رہتے رہتے تین سال گزر جائیں گے! اس کے بعد کامن لا بیدار ہوگا اور ان کے گھر آکر اُسے بیوی بنا دے گا! یہ کیا بات ہوئی؟ کنواری صابرہ کے جسم و جان کے اندر ایک سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اسے سوچ میں گم دیکھ کر روزمیری نے کہا۔

"میری تو سُن لی، اب تم کچھ اپنی سناؤ۔ کیا تم نے کوئی لڑکا دیکھا ہے؟"

صابرہ نے لجاتے ہوئے کہا "پچھلے ہفتے ہمارے وطن سے میرے چچا جان کا خط میرے ڈیڈی کے نام آیا تھا۔ در اصل وہ خط میرے ڈیڈی کے خط کا جواب تھا۔ اس میں ایک لڑکے کی تعلیم، اس کے حال چال اور کردار کی تفصیل لکھی ہے۔ یہ لڑکا میری چچی کا قریبی رشتہ دار ہے۔ خط کے ساتھ اس کی تصویر بھی تھی۔ امّاں اور بابا آپس میں کہنے لگے کہ وہ لڑکا انھیں پسند ہے۔ پھر امّاں نے مجھ سے میری رائے پوچھی تو میں نے کہہ دیا کہ مجھے کب ان کی مرضی سے انکار رہا ہے۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" روزمیری نے صابرہ کو خاموش پایا تو پوچھا۔

"ایسا لگ رہا ہے کہ چھ مہینے بعد ہم سب لوگ تین چار ہفتے کے لیے حیدرآباد جائیں گے اور اس قیام کے دوران میری شادی ہو جائے گی۔"

"اوہ! لڑکے کو دیکھے بغیر، اس سے ملے بغیر؟" روزمیری نے تعجب سے کہا "کیا تم اِس وقت مذاق کرنے کے موڈ میں ہو؟"

"بالکل نہیں۔" صابرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "چچی جان نے دیکھ لیا، بابا نے دیکھ لیا۔ میں نے تصویر دیکھ لی۔ دوسرے حالات معلوم ہو گئے۔ شادی کے لیے یہ کافی ہے۔"

"اُس لڑکے کے ساتھ گھومے بغیر، اس کے خیالات جانے بغیر ہی اس سے شادی کر لوگی کیا؟" روزمیری نے اسی حیرت کے لہجے میں کہا "تم دیوانی تو نہیں ہو گئی ہو، صابرہ؟"

"قطعی نہیں ہوئی۔" صابرہ نے جواب دیا۔

"اس کی محبت کی گہرائی کو پرکھے بغیر، اس کو قریب سے جانے بغیر ـــــ میں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں۔" روزمیری مسکرا کر بولی "مجھے کوئی لاٹری کا پہلا انعام بھی رشوت میں کیوں نہ دے دے، میں یہ اندھا جُوا نہیں کھیل سکتی۔ تمھاری جگہ خود کو رکھ کر سوچ رہی ہوں تو بڑی وحشت ہو رہی ہے۔ او گاڈ ـــ!"

'وحشت'، کا لفظ ادا کرتے وقت روزمیری نے اپنے دونوں ہاتھوں کو یوں کان پر رکھا جیسے کوئی بم پھٹ گیا ہے۔ خدا کو پکارنے کے بعد اس قدر زور سے اس کی لمبی ہنسی اُبھر کر گونجی کہ کیفے ٹیریا میں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی میزوں کے اِردگرد بیٹھے ہوئے لوگ پلٹ پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کچھ لوگوں نے روزمیری کی طویل اور بے ساختہ ہنسی پر مختصر ہنسی سے ردِ عمل بھی ظاہر کیا۔ قریب بیٹھے ہوئے تین آدمیوں میں سے ایک نے پوچھا "تم دونوں کے درمیان بہت ہی دل چسپ باتیں ہو رہی ہوں گی۔ کیوں روزمیری؟ اجازت دو تو ہم بھی اپنی پلیٹیں اُٹھا کر تمھاری میز پر آجائیں، تاکہ ہم بھی خوب جی بھر کے ہنس سکیں۔"

"یہ اجازت نہیں ملے گی۔" روزمیری ہنستے ہوئے بولی۔ "ہماری دل چسپ باتیں ذاتی نوعیت کی ہیں۔ ہنسی کے قابل ہوئیں تو کیا ہوا؟"

صابرہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی دی ہوئی اطلاع عجیب اور ہنسی کے قابل کیسے بن گئی؟ اس نے تو ایک عام بات ہی کہی تھی۔

اس واقعہ کے بعد صابرہ کو اس بات کا شک ہوتا رہا تھا کہ کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہوئے ان لوگوں نے بعد میں کسی وقت روزمیری سے اس کی لمبی ہنسی کی وجہ پوچھی ہوگی اور روزمیری نے جب انھیں وجہ بتائی ہوگی تو ان لوگوں کو بھی اسی طرح طویل ہنسی آئی ہوگی۔ جب روزمیری اس بات پر ہنس سکتی ہے تو دوسرے لوگ جو اسی ماحول کے پروردہ ہیں، کیوں نہ ہنسیں گے۔ بہت دن تک صابرہ کو ایسا لگا کہ لوگ چپکے چپکے اسے دیکھ رہے ہیں اور اس کی شادی کی خبر کو دہرا کر اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

دو تین مہینے کے بعد دفتر میں روزمیری کو وداعی پارٹی دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے بوائے فرینڈ ایلین کو صوبہ البرٹا کے شہر ایڈمنٹن میں ایک پٹرولیم کمپنی میں اچھی ملازمت مل گئی تھی اور ایلین کے ساتھ روزمیری بھی ایڈمنٹن منتقل ہو رہی تھی۔

صابرہ نے اُس دن روزمیری سے اس کا ایڈمنٹن کا پتہ لیا۔ دونوں کی آپس میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ صابرہ نے اسے اطلاع دی کہ اس کی شادی ہوگئی ہے۔ اس کے شوہر اکبر انجینئر ہیں اور کینیڈا آگئے ہیں۔ اس کے بعد صابرہ نے اپنی بچّی زاہدہ کی پیدائش کی خوش خبری بھی لکھ بھیجی۔ زاہدہ دو سال کی ہوگئی تو صابرہ ایک بیٹے کی ماں بنی، جس کا نام فرمان رکھا گیا۔ روزمیری نے لکھا کہ ایلین کے ساتھ اس کی ان بن ہوگئی ہے اور اس نے علیحدگی لے لی ہے۔ اپنے لیے اس نے دوسرا اپارٹمنٹ لے رکھا ہے۔ ایک اور خط میں اس نے لکھا کہ تنہائی کی زندگی میں بڑی آزادی ہے اور آزادی تازگی لاتی ہے۔ شادابی کے ساتھ خوب صورتی بھی از خود آجاتی ہے۔

زاہدہ کی چوتھی سال گرہ ہوئی تو صابرہ نے اپنے خاندان کی تصویر روزمیری کو روانہ کی۔ لیکن وہ خط واپس آگیا۔ ڈاک خانے کی طرف سے جو ربر اسٹامپ ڈالا گیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ روزمیری اس پتے پر نہیں رہتی اور پوسٹ آفس کو اطلاع نہیں ہے کہ وہ کہاں منتقل ہوئی۔

چار پانچ سال یوں ہی تیزی کے ساتھ گزر گئے۔ اب شاپنگ پلازا کی سیڑھیوں پر روزمیری نظر آئی تو صابرہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بھلا روزمیری ٹورنٹو میں کیسے موجود ہوسکتی ہے؟ اور اگر موجود ہے تو اس نے صابرہ کو فون کیوں نہیں کیا؟ ہوسکتا ہے کہ ابھی ابھی آئی ہو۔ صابرہ نے اپنے آپ کو دلاسا دیا۔ وہ اپنی بچّی زاہدہ کے ساتھ تھی اور اس کی نگاہیں شاپنگ پلازہ میں روزمیری کو تلاش کر رہی تھیں۔

اچانک ایک دکان پر روزمیری صابرہ کو نظر آگئی۔ وہ آئس کریم سے لبالب بھرا ہوا بسکٹ کا کون اپنی زبان سے چاٹ رہی تھی۔ دس سال گزرنے کے باوجود روزمیری دس سال پہلے جیسی ہی دل کش اور ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔

صابرہ نے فرطِ مسرت سے پکارا۔ "روزمیری!"

روزمیری "ہائے!" کہہ کر بھاگتی ہوئی آئی اور صابرہ سے لپٹ گئی۔ وہ بولی۔ "مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے تم کو نہ خط لکھا اور نہ فون کیا۔ دراصل میں اپنی شادی کی خبر کے ساتھ تم کو فون کرنا چاہتی تھی۔"

"کتنی اچھی بات بتائی تم نے کہ تمھاری شادی ہو رہی ہے!" صابرہ نے خوش ہو کر کہا۔ "بہت بہت مبارک ہو۔ کس کے ساتھ ہو رہی ہے شادی؟ کچھ تفصیل تو بتاؤ۔"

"ضرور بتاؤں گی۔ سام ٹیلر اس کا نام ہے۔ ایڈمنٹن کے ایک سوشل کلب میں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ بہت مخلص آدمی ہے۔ لہجہ اتنا میٹھا ہے کہ تمھیں کیا بتاؤں۔ البرٹا میں اب ملازمت کے مواقع اتنے اچھے نہیں رہے ہیں۔ اس لیے سام کو میں نے صلاح دی کہ ہم انٹاریو منتقل ہو جائیں گے۔ وہ میری بات مان گیا۔ پچھلے مہینے ہم ٹورنٹو آئے۔ اب سام کو یہاں موزوں ملازمت بھی مل گئی ہے۔ چھ بجے شام کو مجھے لینے کے لیے وہ یہاں آئے گا۔ اگر تم رُک سکتی ہو تو پلیز رُک جاؤ۔ میں تم کو اس سے متعارف کروانا چاہوں گی۔"

"کام کا دباؤ اگر مجھ پر اتنا زیادہ نہ ہوتا تو رُک جانا میرے لیے خوشی کی بات ہو گئی ہوتی۔" صابرہ بولی۔ "خیر، آج نہیں تو کیا ہوا، دوسرا موقع آئے گا۔ شادی کے بعد ہم تمھاری دعوت کریں گے۔۔۔ میری بیٹی زاہدہ سے ملو۔ اب نو سال کی ہو رہی ہے۔"

"ہائے!" روزمیری نے زاہدہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "چہرے کے نقوش دیکھ کر میں پہلے ہی پہچان گئی تھی کہ یہ تمھاری بیٹی ہے۔ بڑی پیاری لگ رہی ہے۔ اتنے زیادہ برس کس قدر تیزی کے ساتھ گزر گئے۔ مجھے تو وہ بالکل پچھلے ہفتے کی بات لگ رہی ہے جب آخری بار میں نے مے اینڈ بیکر میں تمھارے ساتھ لنچ لیا تھا۔"

اس ملاقات کے چھ مہینے بعد روزمیری کی شادی سام سے ہو گئی۔ صابرہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ شادی کی تقریب میں شریک ہوئی۔ زاہدہ کے ہاتھوں میں ایک بڑا گُلدستہ اور صابرہ کے ہاتھوں میں خوب صورت پینٹنگ کا تحفہ تھا جس پر چسپاں کاغذ پر صابرہ نے

لکھا تھا: "خدا تمھیں شادی شدہ زندگی میں ہمیشہ خوشیوں سے نوازے۔"

رات دن کا سلسلہ مہینوں اور برسوں میں بدلتا رہا۔ وہ گرمی کی ایک خوش گوار شام تھی۔ صابرہ نے روزمیری اور سام کو اپنے گھر آنے کا بلاوا دے رکھا تھا۔ گھر کے بیک یارڈ میں صابرہ اور اکبر نے باربی کیو کا اہتمام کیا تھا۔ پہلے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سب شربت پیتے رہے۔ پھر وہ اس کھلے ہوئے کمپاؤنڈ میں آئے جو گھر کے پچھلے حصے میں تھا۔

زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے روزمیری نے صابرہ سے کہا۔ "تمھاری بیٹی تو اب سیانی ہی نہیں، بلکہ قد میں بھی خوب اونچی ہوگئی ہے۔ جو لوگ واقف نہیں ہیں، وہ اُسے تمھاری بیٹی کی بجائے تمھاری بہن سمجھیں گے۔"

صابرہ ہنسنے لگی اور بولی۔ "بڑی کیوں نہ لگے گی۔ اب آخر وہ یونی ورسٹی جارہی ہے۔ یونی ورسٹی جانے والے اسکول جانے والوں کی طرح کم سن تھوڑا ہی دکھائی دیں گے۔"

بہت دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ روزمیری نے بتایا کہ ابھی ان کا فیملی بنانے کا ارادہ نہیں ہے۔ ابھی وہ زندگی کا لطف اُٹھائیں گے، باہر کے ملکوں کی سیر کریں گے اور اس کے بعد آبادی بڑھانے کی سوچیں گے۔ بچّوں کی پیدائش کے بعد باقی زندگی ان کی پرورش کرنے اور ان کی شخصیت کو بلند کرنے میں گزار دیں گے۔ صابرہ کا خیال تھا کہ بچّوں کی پیدائش، ان کی پرورش، خاندان کے افراد کی ہماہمی اور آئے دن کے مسائل زندگی کی خوشیوں کا حصّہ ہیں۔ روزمیری اور سام اس خیال کے حامی نہیں تھے۔ بہت دیر تک خوش گوار فضا میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔

وقت جیٹ کی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ اپنی اپنی مصروفیتوں میں اُلجھے رہنے کے باعث تین سال تک صابرہ اور روزمیری کی ایک دوسرے سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ایک دن صابرہ کو روزمیری کی یاد نے ستایا تو اس نے روزمیری کا فون نمبر ڈائل کیا۔ پتہ چلا کہ وہ فون نمبر روزمیری کا نہیں رہا ہے، کسی اور کے نام الاٹ ہوگیا ہے صابرہ نے

روزمیری کے دیئے ہوئے پتے پر جاکر روزمیری اور سام کو تلاش کیا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ لوگ اپنا اپارٹمنٹ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ کہاں گئے؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

اچانک ایک دن مونٹریال سے روزمیری کا فون آیا۔

"ارے واہ! تم مونٹریال میں کب سے ہو، روزمیری؟" صابرہ نے پوچھا۔

"دو سال ہوگئے۔"

"اچھی تو ہونا؟ سام کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں ——" روزمیری نے صرف اپنی خیریت کی اطلاع دی۔ پھر آگے بولی "میں اس ویک اینڈ پر ٹورنٹو آرہی ہوں۔ تم سے ملاقات کرنا میرے پروگرام کا ضروری حصّہ ہے۔ تم کہیں باہر تو نہیں جارہی ہو؟"

"نہیں جارہی ہوں۔" صابرہ بولی۔ "دراصل میں بھی تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہوں۔ ایک بڑی خاص اور اہم خبر تمھیں دینی ہے۔"

"ضرور۔ تمھاری اہم بات سننے کے لیے میں بھی بے چین رہوں گی۔"

ہفتے کی شام کو روزمیری آئی۔ ڈرائنگ روم میں اطمینان سے بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ روزمیری نے بتایا کہ سام کے ساتھ اس کی نہیں بنی۔ صابرہ کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کر وہ فوراً بولی۔ "دیکھو صابرہ! تم بھی ایک مہذّب اور شریف خاتون ہو۔ کیا تم پسند کروگی کہ تمھارا شوہر دوسری عورت کے ساتھ تعلّقات رکھے اور تم کو بے وقوف بناتا رہے؟"

"کبھی نہیں پسند کروں گی۔"

"یہ بڑی نامناسب بات ہے نا؟ میں نے سام کو ایک دن رنگے ہاتھوں پکڑلیا۔ دونوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ سام سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اسے اب میری بجائے جوائن سے لگاؤ ہوگیا ہے تو شوق سے جوائن کے ساتھ رہنے کے لیے چلا جائے؛ لیکن میرے ساتھ فریب نہ کرے۔"

"ارے!" صابرہ حیرت سے بولی۔" بات اس قدر بڑھ گئی؟"

" ہاں، بڑھ گئی۔ میں نے کہا کہ مجھے وہ میرے حال پر چھوڑ دے۔ اس نے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان بڑی خوش گواری کے ساتھ ایک سمجھوتا ہو گیا۔"

" خوش گواری کے ساتھ سمجھوتا؟ یعنی خوش گوار سمجھوتا؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" آگے جاننے کی جستجو میں صابرہ نے کہا۔

" ہاں، ہاں۔" روزمیری نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔" یہ خوش گوار سمجھوتا علیحدگی کے تعلق سے تھا۔ ہماری طلاق ہو گئی۔"

صابرہ کی زبان گنگ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔" یہ تو تکلیف دہ بات ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہوا۔ افسوس تمھیں بھی بہت ہوا ہو گا۔"

" کاہے کا افسوس؟" روزمیری بولی۔" افسوس کرنے کا عمل زندگی کو اندھیروں میں ڈھکیلتا ہے۔ میں روشنی کی چاہ رکھنے والی ہستی ہوں۔ مجھے روشنی میں رہنے دو، تاکہ میری طبیعت سے ہم آہنگ ہونے والا اور مجھے ڈھونڈ کر اپنانے والا میرا پرنس چارمنگ مجھے دیکھ لے اور بڑھ کر مجھے حاصل کر لے۔ خیر چھوڑو ——— اب تم اپنی خاص بات بتاؤ۔"

" ہم زاہدہ کی شادی کی تیاری کر رہے ہیں۔"

" ہوں۔"

" ہماری کمیونٹی کے اندر ہی یہاں ٹورنٹو میں ایک اچھا لڑکا مل گیا ہے۔ اس لڑکے کے ڈیڈی اور اکبر نے مل کر بات چیت کی اور شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔ اگلے مہینے کی پندرہ کو بکرنگ کے کمیونٹی ہال میں تقریب ہو گی۔ تمھارا دعوت نامہ تیار ہے۔"

" یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" روزمیری نے کہا۔

" ہاں۔" صابرہ نے کہا۔" بس ایک منٹ ٹھیرو۔ میں تمھارا دعوت نامہ ابھی لے کر آتی ہوں۔" صابرہ نے پھرتی دکھائی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ

میں ایک دِل کش رنگ کا لفافہ تھا۔

لفافے میں سے خوب صورت ڈیزائن کے کارڈ کو نکال کر روزمیری خاموشی سے پڑھنے لگی۔ بہت دیر تک کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دعوت نامے کے الفاظ اُبھر اُبھر کر کانٹے بن رہے ہیں۔ روزمیری کی نگاہیں ہاتھ بن گئے۔ اپنی نگاہوں کے ہاتھوں سے اُن اُبھرے ہوئے الفاظ کو کھرچ کر روزمیری اپنے منہ میں رکھ رہی ہے۔ وہ الفاظ کو چبا رہی ہے، تاکہ الفاظ کانٹے نہ بنیں، نرم اور ملائم ہی رہیں۔

"شکریہ" کہہ کر روزمیری نے کارڈ کو اپنے پرس میں رکھ لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔ "میرے ذہن میں عجیب سے سوالات آ رہے ہیں۔"

"کیسے سوالات؟" صابرہ نے پوچھا۔

"میں تمھارے ملک میں کیوں پیدا نہیں ہوئی؟"

"وہاں تم اس لیے پیدا نہیں ہوئیں کہ تمھارے ماں باپ وہاں نہیں تھے۔ بات سیدھی تو ہے۔"

مگر بات سیدھی نہیں تھی۔ اس لیے صابرہ کے جواب پر دھیان دیئے بغیر روزمیری نے اپنے ذہن کا دوسرا سوال ظاہر کیا: "وہاں پیدا ہونے کے بعد اس ملک میں امیگرنٹ بن کر کیوں نہیں آئی۔"

"کیا فرق ہو گیا ہوتا؟ تم تو پیدائشی طور پر یہاں کی شہری ہو۔ یہاں کی تعلیم یافتہ ہو۔"

"فرق ہو گیا ہوتا۔" روزمیری نے جواب دیا۔ "منجدھار میں ہچکولے کھاتی ہوئی میں اپنے لیے شوہر کی تلاش میں ماری ماری پھرنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ ساحل پر کھڑی ہوئی اپنے بچّوں کے لیے جیون ساتھی کے انتخاب کا اعزاز حاصل کر رہی ہوتی۔ ایک دو سال میں نانی، دادی بن گئی ہوتی۔"

"نانی، دادی" کے الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے نگاہوں کو نیچا اور سر کو ٹیڑھا کیا اور صابرہ کو یوں دیکھا جیسے کم زور نگاہوں کی نانی اپنی نواسی کو بڑی شفقت کے ساتھ دیکھ رہی ہے۔ روزمیری کے انداز میں اس کی اپنی شخصیت کا تمسخر

جھلک رہا تھا۔ تمسخر بچھو ہے تو ہنسی اس کا ڈنک ہے۔ روزمیری نے اپنے آپ کو ڈنک مارا۔ اس کا قہقہہ زور سے چھوٹا۔ ہنسی اتنی زوردار اور طویل تھی کہ سارے گھر میں گھنٹیاں بجتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ صابرہ کے بچے زاہدہ اور فرمان اپنے کمروں میں سے باہر آئے اور ڈرائنگ روم میں جھانکنے لگے، تاکہ پتہ چلائیں کہ وہاں کیا دلچسپ ہنگامہ برپا ہو رہا ہے۔ وہ بھی اس گونجنے والی خوشی میں شریک ہونا چاہتے تھے۔

لیکن صابرہ نے محسوس کیا کہ روزمیری کی ہنسی معمول سے مختلف ہے۔ صابرہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ روزمیری کی ہنسی ایک آئینہ ہے۔ اس آئینے کی سطح پر وہ اپنی نمائش کے ساتھ فریاد بھی کر رہی ہے کہ دیکھو، میں ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہوں، میرے بدن کے اندر کرچیں ہیں، کانٹے ہیں اور رستے ہوئے خون کے ساتھ زخم اتنے ہیں کہ ان کا حساب نہیں ہے۔

روزمیری کی ہنسی برسوں پہلے بھی اسی طرح گونجی تھی۔ صابرہ کے ذہن کے دریچے کھل گئے۔ یہی کوئی بیس سال ہوئے ہوں گے، صابرہ کی شادی سے ذرا پہلے۔ ایسی ہی ہنسی دندناتی ہوئی آئی تھی اور کانٹا بن کر صابرہ کی روح کے کسی حصے میں چبھ گئی تھی۔ وہ چبھن تکلیف بھی پہنچاتی رہی تھی۔ مگر وقت نے اپنے پر ایسے پھیلائے کہ ذہن و دل پر بیٹھا ہوا وہ داغ روپوش ہو گیا۔ آج اس کی بیٹی زاہدہ کی شادی کی اطلاع پر روزمیری کی سنناتی ہوئی ہنسی انداز میں ویسی ہی تھی، لیکن اب اس میں صابرہ کے لیے تمسخر کا پہلو نہیں تھا' بلکہ روزمیری کی اپنی شکست خوردگی کی چھاپ تھی۔ اس وقت کی ہنسی سے جو سوالیہ نشان بنا تھا، آج یہ ہنسی خود اس سوال کا جواب دے رہی تھی۔ وہ سوال زخم تھا۔ یہ جواب مرہم ہے۔ آن کی آن میں وہ روپوش داغ کافور ہو گیا اور صابرہ کھل اٹھی۔ روزمیری کو تسلی دینے کی خاطر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بڑھ کر اس نے روزمیری کو گلے سے لگا لیا۔

داداجان کی وصیّت

ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ اس کے مغربی کنارے پر ایک خوب صورت گاؤں آباد ہے۔ اس گاؤں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں پر سام کا سفید بنگلہ ہے۔ یہ سفید بنگلہ اتنا اونچا ہے کہ جھیل کے مشرقی کنارے پر بسے ہوئے گاؤں کے لوگ بھی اس بنگلے کو دیکھ سکتے ہیں۔ مشرقی کنارے سے لوگ صرف سام کے سفید بنگلے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اپنے سفید بنگلے کے اوپری منزل کے جھروکے میں کھڑا ہو کر اپنی طاقتور دوربین کے ذریعے سام مشرقی کنارے کے تمام گھروں پر نظر رکھ سکتا ہے۔ مشرق کے گاؤں کی سڑک پر دوڑتے والی ہر کار کو وہ پہچانتا ہے۔ اپنے گاؤں کی سیاست پر سام خوب اثر انداز ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس مشرقی گاؤں کی سیاست پر بھی اپنا اثر جمائے رکھنا چاہتا ہے۔ یہ ضروری ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو دیکھتے ہی دیکھتے مشرقی گاؤں کے بھائیوں کی برادری بڑی طاقتور ہو جائے گی اور ان میں کا کوئی بھائی بڑی آسانی کے ساتھ سام کو اٹھا کر پٹک دے گا۔ سام اپنی زندگی میں کبھی ایسا دن نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لیے سام ان بھائیوں کے درمیان پھوٹ کا بیج ڈالتا رہتا ہے اور درخت کی ہر ٹہنی کو بڑھنے سے قبل کاٹ دینے کے

اصول پر عمل پیرا ہے۔ اس کی طاقت ور دوربین اس بارے میں اس کی بڑی مددگار ہے۔ دونوں گاؤں کے مقتدر لوگوں کے پاس کاریں ہیں۔ لیکن سام کے ہاں کار کے علاوہ ہیلی کاپٹر بھی ہے۔ اس ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہ دونوں گاؤں کے کسی گھر کی چھت پر بڑی آسانی اور اتنی ہی سرعت کے ساتھ اتر سکتا ہے۔ مشرقی گاؤں کے بھائیوں کی برادری سام کی سیاست کو پہچانتی ہے۔ وہ سام سے سہمے ہوئے ہیں لیکن سام سے دور رہنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بھائی اپنے دوسرے بھائی سے محبّت کرنے کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف اختلافات رکھتا ہے۔ سام اس راز کو جانتا ہے۔ اس لیے ان اختلافات کو ہوا دے کر ان بھائیوں کے درمیان اونچی دیواریں کھڑی کرنا اور ان کو قائم رکھنا اس کے عظیم فرائض میں سے ہے۔ اس طرح یہ بھی ہے کہ ہر بھائی ایک خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے۔ ہر بھائی سمجھتا ہے کہ اختلافات کے باعث جب اس کی اپنے دوسرے بھائیوں سے مڈبھیڑ ہوگی تو سام کی مدد صرف اسی کو ملے گی۔

مشرقی گاؤں کے تمام بھائیوں کی نگاہیں اپنے بڑے بھائی پر بھی مرکوز ہیں۔ اگر سام بھائیوں کے درمیان پھوٹ پھیلا رہا ہے تو صرف بڑے بھائی ہی ہیں جو اس شرارت کے خلاف تمام بھائیوں کو کوئی موثر تجویز یا اس کی سیاست کی پیچیدگی سے بچائے رکھنے کے لیے کوئی حل دے سکتے ہیں۔ بڑے بھائی بڑی آسانی سے تمام بھائیوں کے رہنما اور رہبر بن سکتے ہیں۔ ان کے ہاں داداجان کی نشانیاں ہیں اور وصیت نامہ بھی۔ سال میں ایک بار تمام بھائی جو ایک ہی داداجان کی اولاد ہیں، بڑے بھائی کے گھر پر جمع ہوتے ہیں تاکہ داداجان کی چھوڑی ہوئی نشانیوں کو دیکھیں، ان کی باتوں کو یاد کریں اور ان کے وصیّت نامے کو پڑھیں۔ اس وصیت نامے میں بھائیوں کے آپس کے اتفاق، مساوات، قناعت اور خلوص و محبّت کی نصیحت ہے۔ انھیں تاکید کی گئی ہے کہ وہ سام اور اس کے سالے یادا کی باتوں پر بھروسہ نہ کریں۔ بڑے بھائی سب کچھ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی توجہ نہیں دیتے۔ وہ ہمیشہ اپنی آرام کرسی

پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کرسی پر سے وہ اُٹھتے ہی نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اپاہج ہیں اور اُٹھ نہیں سکتے۔ ان کے نہیں اُٹھنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی وہ آرام کرسی سونے کی بنی ہوئی ہے۔ اس میں دنیا بھر کے قیمتی ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ بڑے بھائی جان کو اس کرسی کے ساتھ بڑی محبّت ہے۔ وہ اس کرسی کو اپنے جسم اور اپنی زندگی کا حصّہ بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر اپنے بھائیوں کی خاطر گاؤں کی سیاست کے دنگل میں انھیں کودنا پڑے گا تو ان سے یہ کرسی چھوٹ سکتی ہے کیوں کہ اس کی چکاچوند روشنی بہت سے لوگوں کی توجہ مبذول کرنے کا باعث بن جائے گی۔ لوگ سوال کریں گے کہ جب داداجان ایسی کرسی استعمال نہیں کیا کرتے تھے تو یہ بڑے بھائی ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ بڑے بھائی نہیں چاہتے ہیں کہ کوئی ان کی طرف دیکھے۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنی کرسی سنبھالنا چاہتے ہیں اور اس پر بیٹھا رہنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی بندہ داداجان کی نشانیوں اور وصیّت کو یہاں سے اُٹھا کر کہیں دوسری جگہ لے جانا چاہتا ہے تو ضرور ایسا کرے اور بس انھیں تنہا ان کی کرسی کے ساتھ چھوڑ دے۔ سام کے لیے مشرقی گاؤں کا یہ پس منظر اور بڑے بھائی کا صرف اپنی کرسی سے محبّت کرنا یوں دل کو خوش کرنے والی بات تھی جیسے سام مچھلی کا شکار کرنے کے لیے تالاب پر گیا ہو اور مچھلی اس کے سامنے پانی کی سطح پر آ کر خود ہی اُچھل اُچھل کر کہہ رہی ہو —— " سام! تمھارا شکار ہونے کے لیے میں آگئی ہوں۔ مہربانی کر کے ذرا اپنی شکار کی چھڑی ادھر کنارے پر لگا تا کہ اس کے گل کے کانٹے کو میں اپنے حلق میں اٹکالوں اور اپنے آپ کو تمھارے حوالے کر دوں۔"

مشرقی گاؤں کی ان مچھلیوں کا شکار کرنے اور انھیں بھون کر کھا لینے کی خواہش لے کر سام نے بڑے بھائی سے کہا کہ ان کی کرسی ان کی شخصیت پر خوب سجتی ہے۔ یہ کرسی ان کا اثاثہ اور ان کا حق ہے۔ اس لیے دوستی کے ناطے وہ یہ ذمّے داری لے گا کہ بڑے بھائی کی حق تلفی کرنے کی کبھی کوئی جرات ہی نہ کر سکے۔ سام ان کے اثاثے کی حفاظت کرے گا۔ سام کے اس دلیرانہ اعتراف کے باعث بڑے بھائی سام سے

بڑے مرعوب ہو گئے۔ انھوں نے جان لیا کہ سام بہت عظیم ہے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے انھوں نے سام کی عظمت کے سامنے اپنے سر کو جھکا دیا۔

اپنے سفید بنگلے کی اوپری منزل کے جھروکے میں سے سام نے دیکھا کہ جھیل کے اس کنارے کی طرف سے ایک تیز رفتار کشتی آرہی ہے۔ سام نے تعجب کے ساتھ اپنے سکریٹری سے پوچھا کہ ادھر کی جانب وہ کون آرہا ہے کیوں کہ اس دن کسی سے ملاقات کرنے کا کوئی وقت طے نہیں تھا۔ سکریٹری نے جواب دیا کہ وہ کشتی سام کے برادر نسبتی یادا کی کشتی ہے۔

"اوہ! سالے بھائی آرہے ہیں ——" سام کے لبوں پر مسکراہٹ آئی۔ یادا کا قد بونا تھا۔ وہ تیز چلتا ہوا یوں لگتا تھا جیسے کوئی بچہ پتنگ لوٹنے کے لیے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بھاگ رہا ہے۔ اپنے دولھے بھائی کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی خاطر یادا کو میز پر چڑھ کر کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ کبھی سام خود ہی اُسے اٹھا کر میز پر کھڑا کر دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد جنگل کی نامعلوم جگہوں سے سام نے اپنے سالے بھائی کے لیے چند جڑی بوٹیاں کھوج نکالیں جن کا جوشاندہ بنا کر صبح شام سالے بھائی کو شہد کے ساتھ ملا کر پلایا۔ اس کا نتیجہ اچھا نکلا۔ سالے بھائی کا قد کسی قدر بڑا ہوا۔ اب یادا کو میز پر چڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہاں البتہ کرسی پر خود ہی چڑھ کر کھڑا ہو جاتا ہے تو سالے اور بہنوئی کے سر ایک ہی اونچائی کی سطح پر آجاتے ہیں۔ یادا بھی مشرقی گاؤں میں رہتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد یادا سام کے سفید بنگلے کی اوپری منزل پر آگیا۔ دونوں جھروکے میں بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ ہمیشہ دو تین موضوع ہی ان کی ساری گفتگو کا لب لباب ہوا کرتے ہیں۔ یادا نے سام سے پوچھا کہ چھریاں، کانٹے اور قینچیاں بنانے کا اس کا کارخانہ کیسا چل رہا ہے۔ سام نے بڑی خوشی کے ساتھ جواب دیا کہ اس کا کاروبار خوب بڑھ رہا ہے۔ اسی لیے اپنے کارخانے میں اس نے نئے پلانٹ کا اضافہ کیا ہے۔ بات یہیں نہیں رُکی۔ سام کے کاروبار میں نئی ایجاد بھی ہو رہی ہے۔ ابھی

ابھی سام نے ایک نیا بھالا ایجاد کیا ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ جب وہ کسی جانب پھینکا جاتا ہے تو خود بخود اس کے اندر سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ برچھے کی تیز انی پھینکے جانے پر چھید ڈالتی ہے اور شعلے بھڑک کر ہر اس چیز کو جلا ڈالتے ہیں جہاں کہ بھالا پھینکا گیا ہے۔ سام کے دل میں خواہش ہے کہ وہ اس بھالے کو جھیل کے مشرقی گاؤں میں رہنے والے بھائیوں کے گھروں کو جلانے کے لیے استعمال کرے۔ یہی خواہش یادا کے دل میں بھی ہے۔ سام اور یادا کی باتوں کا دوسرا موضوع ان بھائیوں کی ملکیت میں چلنے والی بیکریاں ہیں۔ بڑے بھائی، منجھلے بھائی اور چھوٹے بھائی کی بیکریاں دوسرے رشتے دار بھائیوں کی بیکریوں کے مقابلے میں اچھی خاصی بڑی ہیں۔ ان کی بیکریوں میں انواع و اقسام کی ڈبل روٹیاں اور کیک بنتے ہیں۔ سام کا استدلال ہے کہ ان بیکریوں کی بنی ہوئی ڈبل روٹیاں اور کیک سام کے کارخانے کی چھریوں اور چاقوؤں سے کٹتے ہیں۔ اس لیے ان روٹیوں اور کیک کی قیمت کو لاگو کرنے کے فیصلے پر سام کی رائے کا اثر انداز ہونا بھی ضروری ہے۔ قیمت کے کنٹرول کی اس سیاست میں سام کامیابی حاصل کرتا چلا جا رہا تھا۔ کیوں کہ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی سام کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ مسئلہ صرف منجھلے بھائی کا تھا۔ دوسرے رشتے دار بھائی سام کے گرویدہ نہیں تھے اس لیے متحد ہو کر سام کے لیے خطرے کی گھنٹی بن سکتے تھے لیکن ان میں اتحاد تھا ہی نہیں تو بھلا کیا خاک وہ خطرے کی گھنٹی بن سکتے۔

اس ملاقات میں یادا منجھلے بھائی کی سرکشی کی شکایت کر رہا تھا۔ منجھلا بھائی سرکش ہوتا جا رہا ہے۔ منجھلے بھائی نے انکار کر دیا ہے کہ وہ قیمت کی سطح کو نیچے رکھے گا۔ ڈبل روٹی اور کیک لوگوں کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہیں۔ قیمت اونچی ہو تب بھی وہ خریدیں گے۔ ایسی صورت میں منجھلا اپنی دولت میں اضافہ کرے گا اور زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔ یادا نے اپنے دوطھے بھائی کو یہ تازہ خبر بھی دی کہ قیمت کی اس تکرار میں منجھلے بھائی اور چھوٹے بھائی کے درمیان ان بن ہو گئی ہے۔

اچانک سام نے منجھلے کا فون نمبر ملایا۔ ادھر منجھلے نے اسے اٹھایا۔

سام بولا ——— "میں تمھارا دوست ہوں منجھلے!"

"مجھے تمھاری دوستی سے انکار نہیں ہے" منجھلے نے جواب دیا۔

"تب ہماری بات اسی نکتے سے شروع ہو رہی ہے منجھلے ——!" سام نے اپنی سیاست کا تیر پھینکا ——— "ہمارے گاؤں کی یہ ریت ہے کہ جو چھوٹا ہوتا ہے وہ بڑے کی بات کا لحاظ رکھتا ہے۔ تمھارے چھوٹے بھائی نے تمھارا لحاظ نہیں رکھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمھارا دل اس نے دُکھایا ہے۔ کیا بڑے بھائی نے اس کی تنبیہہ نہیں کی؟"

"بڑے بھائی ——" منجھلا ہنسا اور بولا ——— "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بڑے بھائی کو صرف اپنی کرسی سے محبت ہے۔ بھائیوں سے انھیں محبت ہے یا نہیں، کوئی نہیں جانتا کیوں کہ وہ کچھ کہتے ہی نہیں۔"

"تب تم ہی چھوٹے کو سزا دے کر سبق سکھاؤ۔"

"میں دوں ——؟" منجھلے نے تعجب سے پوچھا، پھر بولا "میں کیسے دوں؟"

"میں جانتا ہوں منجھلے کہ اس کا گھر اور اس کی بیکری تمھارے گھر اور تمھاری بیکری کا حصّہ تھے۔ اس نے تم سے لے لیا اور آپس کی مروّت کے باعث تم نے خاموشی اختیار کر لی۔"

"ہاں سام! تم حقیقت سے واقف ہو۔"

"اس کو سبق دینے کی خاطر منجھلے! تم اس کی بیکری کا ایک حصّہ اپنی بیکری کے اندر کر لو۔ وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ الٹا تمھاری منّت سماجت کرے گا۔"

"ہاں وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا سام! اس تجویز کا شکریہ! لیکن اس میں تمھاری کوئی چال تو نہیں ہے سام؟ ایسا نہ ہو کہ چھوٹے کے ساتھ مل کر تم مجھ سے لڑنے کے لیے آجاؤ۔"

سام ہنسا اور بولا ——— "یہ تمھارا خاندانی معاملہ اور تمھارا کاروباری نکتہ ہے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں تمھارے گاؤں اور تمھارے خاندان سے باہر کا آدمی ہوں۔ اگر چھوٹے کی مدد کے لیے آیا تو مجھے گاؤں سے باہر

کرنے کے لیے تمھارے تمام چچازاد اور تایازاد بھائی میرے خلاف آجائیں گے۔ میں اپنی بے عزتی کروانا نہیں چاہوں گا۔"

"تم پنچایت کھڑی کردو گے۔ دونوں گاؤں کی ملی جلی پنچایت کا صدر تمھاری مٹھی میں ہے۔ تم اس کے ذریعے سے شور و غوغا کرو گے۔"

"تھوڑی بہت ضابطے کی پابندی تو ہوگی ہی" ——— سام بولا ——— "بات اُٹھے گی اور دب جائے گی لیکن تمھارا اپنا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ بات اہمیت کی ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد بات ختم ہو گئی۔ سام نے فون رکھ دیا۔

یادا نے گھبرا کر پوچھا کہ سام نے ایسا کیوں کیا۔ چھوٹے کا حصہ لینے کے بعد منجھلا زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔ سام نے یادا کو تسلّی دی کہ وہ تماشہ دیکھے۔ اس کھیل کے اختتام پر منجھلا بونا ہو جائے گا۔ اس کے برخلاف یادا قد آور اور طاقتور بن جائے گا۔

دوسرے دن یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی کہ منجھلے نے چھوٹے کی ساری بیکری اور تمام گھر پر قبضہ کر لیا۔ اپنی جان کی خیر منانے کے لیے چھوٹے نے بڑے بھائی کے گھر میں پناہ لی۔

سام نے بڑے بھائی کو فون کیا اور گفتگو ہوئی کہ منجھلا سرکشی میں بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ کسی وقت بڑے بھائی کی بیکری اور گھر پر قبضہ کر لے گا۔ اس لیے بڑے بھائی کی حفاظت کے لیے وہ خود آ رہا ہے۔ بڑے بھائی کا سر احسان سے جھک گیا۔

سام نے پنچایت بلائی۔ دونوں گاؤں کے لوگ آئے۔ پنچایت نے منجھلے کو وارننگ دی۔ منجھلے نے جواب دیا کہ اسے کسی وارننگ کی پروا نہیں ہے۔ چھوٹے کا گھر اور بیکری اس کی ملکیت ہے۔ اس لیے انھیں نہیں لوٹائے گا۔ تب سام کے کہنے پر پنچایت نے سام کو اختیار دیا کہ سام دونوں گاؤں کے کوئی دو درجن آدمیوں کو لے کر مشرق کے گاؤں میں جائے اور منجھلے کے قبضے میں سے چھوٹے کی بیکری اور گھر کو چھڑائے۔

منجھلے نے اعلان کیا کہ اگر سام اس پر حملہ کرے گا تو وہ یادا کو نہیں چھوڑے گا۔ یادا منجھلے کے حملے کا جواب دے گا تب منجھلے کے تمام چچازاد اور تایازاد بھائی جو یادا کو پسند نہیں کرتے ہیں منجھلے کا ساتھ دینے کے لیے آجائیں گے۔

یادا نے گھبرا کر سام کو فون کیا —— "سُن لیا نا آپ نے منجھلے کا اعلان! دولھے بھائی اب کیا کرو گے؟"

"سالے بھائی تم دیکھتے رہو ——" سام نے بڑے اطمینان سے کہا —— "جو بھی مجھے کرنا ہے اس کا میں یوں ڈھنڈورا نہیں پیٹوں گا۔"

منجھلے کے چند چچازاد بھائی سام کے قرضدار تھے۔ سام نے ان کے قرض معاف کر دیئے تاکہ وہ سام کے احسان مند رہیں، اور منجھلے کا ساتھ نہ دیں۔ سام کی ہدایت پر بڑے بھائی نے دوسرے بھائیوں کو اپنی بیکری کی ڈبل روٹیاں اور کیک مفت میں دیں تاکہ وہ بڑے بھائی جان کی خوشنودی کو قائم رکھنے کے لیے سرکشی کرنے والے منجھلے بھائی کا ساتھ نہ دیں۔

سام اپنا ہیلی کاپٹر لے کر اڑا اور بڑے بھائی کے گھر کے آنگن میں اُترا۔ اس کے ساتھ برچھے، چھریاں اور دوسرے ہتھیاروں کی بڑی تعداد تھی۔ دو درجن لوگ بھی الگ الگ راستوں سے بڑے بھائی کے گھر پر آ گئے۔ بڑے بھائی نے سب کو اپنا مہمان بنا لیا۔ سام کی لائی ہوئی تمام چیزوں کو بڑے بھائی نے خرید لیا کیوں کہ سام کے کہنے کے مطابق وہ بڑے بھائی کی حفاظت اور چھوٹے بھائی کو ان کا حق دلانے کے لیے آیا تھا۔ بڑے بھائی کو اس کا یقین بھی تھا۔

منجھلے نے یادا پر تیر پھینکا۔ یادا بلبلانے لگا اور بولا "میں جواب دوں گا۔ میں بدلہ لوں گا۔"

"نہیں ——" سام نے یادا کو پکارا —— "ابھی نہیں۔ تم مار کھاؤ، جواب نہیں دو۔ تمہارا جواب میں دوں گا۔ تمہارے ہر زخم کو میں خرید رہا ہوں —— بے شمار اشرفیوں کے عوض میں —— تمہارے زخم میرے زخم ہیں۔ اس لیے بدلہ میں لوں گا

تم خاموش بیٹھ کر اپنے زخموں کی گنتی کرو اور انھیں مجھے فروخت کرتے رہو۔ تم میری بات کو سمجھو سالے بھائی۔"

سالے بھائی کو اپنے دو طبے بھائی کی بات سمجھ میں آگئی۔

سام نے منجھلے کے گھر پر حملہ کیا۔ وہ اور ان کے دو تین ساتھی سام کے لائے ہوئے ہیلی کاپٹر پر بیٹھ گئے۔ منجھلے کے گھر پر ہیلی کاپٹر آیا۔ سام نے اپنے کارخانے کی نئی ایجاد کردہ بھالے پھینکے۔ منجھلے کے گھر کی چھت پر چھید پڑے اور چھیدوں میں سے چنگاریاں نکلیں۔ چنگاریاں شعلے بن گئے۔ ابتدا میں شعلے دبے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھڑک کر اونچے ہو گئے۔ خوب دھواں اٹھا اور بیکریاں جلنے لگے۔

منجھلے کو اپنی بیکریوں میں کام کرنے والے کاریگروں اور کارندوں پر اعتماد تھا، وہ محافظ بھی تھے اور جانباز بھی۔ انھوں نے کوشش کی کہ بیکریوں کو آگ لگنے نہ پائے۔ لیکن آگ لگ گئی۔ سام کی نئی ایجاد اپنی کاریگری میں بڑھ چڑھ کر تھی۔ منجھلے کے محافظ بے بس ہو گئے۔ وہ زخم پر زخم کھانے لگے اور بے دم ہو کر گرنے لگے۔

منجھلا مجبور ہوتا جا رہا تھا۔ جب مجبوری اور بے بسی بڑھ گئی تو وہ چلّایا۔

"میں چھوٹے کا گھر اور بیکری چھوڑ رہا ہوں۔ سام تمھاری بات پوری ہو گئی۔ تم نے انھیں مجھ سے چھڑا لیا ہے۔ اب تم یہاں سے لوٹ جاؤ۔"

سام نہیں گیا۔ منجھلا دھوئیں کی تاب نہ لا کر بے دم ہو گیا۔ اور نیچے پیٹ کے بل گر پڑا۔ سام نے ایک جست لگائی، اور منجھلے کے گھر کے اندر کود گیا۔

درد سے کراہتے ہوئے منجھلا بولا۔

"جس مقصد کے لیے تم اس گاؤں میں آئے تھے اُس میں تم کامیاب ہو چکے ہو۔ اب میرے گھر کے اندر کیوں داخل ہو گئے۔ یہاں سے چلے جاؤ۔"

"نہیں جاؤں گا ——" سام بولا —— "اسی لمحے وہ بڑھ کر اٹھا، پڑے ہوئے منجھلے کے ٹخنوں پر چڑھ گیا۔ منجھلا درد کے مارے چلّانے لگا تو سام کہنے لگا۔

"میرے لیے یہ سنہری موقع ہے۔ میں تمھارے ٹخنے کی ہڈیاں توڑ رہا ہوں منجھلے!

تاکہ آئندہ کبھی تم میرے سامنے کھڑے ہونے کی جرأت نہ کر سکو۔"

سام منجھلے کے ٹخنوں پر زور زور سے اچھلنے لگا۔ منجھلا درد سے بے تاب ہو کر کراہ رہا تھا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں تڑپ کر بولا۔

"تم اس میں بھی کامیاب ہو گئے۔ اب نکل جاؤ میرے گھر میں سے۔"

"نہیں" —— سام بولا —— "مجھے تمھارے گھر کی تلاشی لینی ہے۔"

نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہ کر منجھلے نے پوچھا —— "کس بات کے لیے؟"

سام بولا —— "ڈبل روٹیاں اور کیک بنانے کی بیکریوں میں تم پوشیدہ طور پر بارود بھی بنا رہے ہو۔ مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ تمھارے گھر میں بارود کا ایک بڑا ذخیرہ چھپا ہوا ہے۔ مجھے بتا دو کہ وہ کہاں ہے؟"

"اگر یہ بات سچ ہے تب بھی تمھیں اس بات کا اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ تم میرے گھر کی تلاشی لو۔"

"دونوں گاؤں کی امن و سلامتی کی خاطر گاؤں کی پنچایت کے پاس یہ حق ہے کہ وہ تمھارے گھر کی تلاشی لے اور پنچایت نے اس بات کا پورا اختیار مجھے دیا ہے۔"

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو" —— منجھلا چلایا۔

منجھلے کے ٹخنوں پر کھڑے ہو کر سام نے زور سے اپنے بدن کا جھٹکا دیا۔ منجھلا جو نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا، کراہا تڑپا اور پوری طرح بے ہوش ہو گیا۔

منجھلے کے جسم پر سے نیچے اُتر کر سام نے یادا کو فون کیا۔

یادا کہہ رہا تھا —— "دوطھے بھائی! ایک اچھی خبر پہلے آپ مجھے سنائیے گا تو دوسری اچھی خبر میں آپ کو سناؤں گا۔"

سام کہنے لگا —— "لو سنو! میں نے منجھلے کے ٹخنے کی ہڈیاں توڑ دی ہیں۔ اب وہ ایک طویل عرصے تک نہ تمھارے روبرو کھڑا ہو سکے گا اور نہ میرے سامنے۔"

"یہ تو واقعی بڑی اچھی بات ہے۔"

"اب بتاؤ کہ تم کون سی اچھی خبر مجھے سنا رہے ہو؟" سام نے پوچھا۔

"دو طے بھائی ——— !" یادا بولا ——— "میرا قد بڑھنے لگا ہے۔ اب آپ سے آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کرنے کی خاطر مجھے کرسی پر نہیں چڑھنا پڑے گا۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ چھوٹی تپائی پر چڑھ کر آپ سے بات کر سکتا ہوں۔"

سارے گاؤں میں سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ لوگ چُپ چاپ سوچ رہے ہیں کہ منجھلے نے ابتدا میں چھوٹے کے خلاف جو حرکت کی تھی وہ مناسب ہرگز نہیں تھی۔ لیکن سام نے یہاں آکر جو طوفان برپا کر دیا ہے وہ منجھلے کے غیر موزوں عمل کی سزا نہیں ہے۔ وہ کچھ اور ہے۔ سام کا حملہ بہت زیادہ بڑھی ہوئی نامناسب حرکت ہے۔

سارے بھائی سکتے میں ہیں۔ یوں لگ رہا ہے کہ اس سکتے نے انھیں پتھر کا بنا دیا ہے۔ بڑے بھائی اپنی کرسی پر حسب معمول بیٹھے ہیں، البتہ یادا اور سام کی نگاہیں بڑے بھائی کی حویلی پر لگی ہوئی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بھائی ادھر آنکلے، اور بھائیوں کو متحد کرنے کی خاطر اپنی آواز کو زوردار بنائے اور دادا جان کی وصیّت کو پڑھنا شروع کر دے۔ ایسا اگر کبھی ہو گیا تو خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔

گدھے کی پیٹھ پر پری کا ناچ

ہمارا جہاز جب کسی دہشت پسند کے بم سے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے بغیر پرانی دنیا کی سرزمین پر میرے چھوڑے ہوئے وطن کے ایئرپورٹ پر ٹھہرا تو میں نے اپنے کان کھڑے کر لیے۔ ایئرہوسٹس نے مجھے باہر کی جانب نکلنے والے دروازے کی سمت بتا کر دھکا دیا۔ وہ نئی دنیا کی گوری ایئرہوسٹس تھی ..... میں نے مسکرا کر "شکریہ" کہا۔ اگر وہ اپنے ملک کی کوئی چنگبری ہوتی تو اس کو میں نے ..... کئی اسباق یاد دلا دیئے ہوتے۔ گورے لوگ دھکے مارتے ہیں تو ہمیں "شکریہ" کہہ کر بڑی سعادت مندی کے ساتھ اپنے ہی اسباق یاد کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ شاید یہ انسانیت کے گورے اصول ہیں جنہیں اپنا کر ہم تسکین حاصل کرتے ہیں۔

سیڑھیاں اُتر کر میں ٹرمنل میں آیا۔ ٹرمنل سے نکل کر بلڈنگ کی لابی میں آیا۔ مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ خیر مجھے کسی سے کیا لینا ہے۔ کوئی آئے نہ آئے میری جوتی سے۔ لیکن دل ضرور چاہا کہ وہ آ گئی ہوتی جس کے فراق میں مَیں نئی دنیا میں بہت تڑپا ہوں۔ اس کو حاصل کرنے کے گرجتے ہوئے فیصلے کی ہی وجہ سے تو میں نے یہ اتنا لمبا سفر اختیار کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ مَیں

ائیرپورٹ کی لابی میں کچھ دیر کے لیے سستالوں۔ خاموش آواز میں دل بار بار پکار رہا تھا۔ "شہرت بانو! تم کہاں ہو؟ میں تمھیں کیسے تلاش کروں؟"

ائیرپورٹ کی لابی کے ایک گوشے میں دو صوفے پڑے ہوئے تھے۔ ایک صوفہ چھوٹا تھا لیکن اس کے مقابل کا صوفہ کسی قدر بڑا۔ چھوٹے صوفے پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑا صوفہ زیادہ کشادہ تھا۔ اس پر بھی دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ البتہ ان دونوں آدمیوں کے درمیان اتنی جگہ تھی کہ میں آسانی سے بیٹھ سکتا تھا اس لیے اس درمیانی جگہ پر بیٹھنے کے لیے میں آگے بڑھا۔ چاروں آدمی شہر کے معززین لگ رہے تھے۔ اس میں شک ہی کیا ہے، ائیرپورٹ پر آنے والے سب ہی لوگ یوں بھی اپنی وضع قطع سے بڑے معزز لگتے ہیں۔

مجھے اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے کان میں پھونکا۔

"وہ دیکھو گدھا اِدھر ہی آرہا ہے۔"

بڑے صوفے کے کنارے پر بیٹھا ہوا وہ دوسرا آدمی اندر کھسک کر بولا۔ "اگر وہ یہاں آکر بیٹھ جائے گا تو بڑا غضب ہوگا۔ ہم اگلے جہاز سے آنے والے وزیر کو خوش آمدید کہنے کے بعد بلا شرکتِ غیرے اپنے درمیان نہیں بٹھا سکیں گے۔"

"دوسری موزوں جگہ کی تلاش ہی میں رہ جائیں گے اور ہمارا پلان دھرا ہی رہ جائے گا۔" بڑے صوفے کے دوسرے کنارے پر بیٹھے ہوئے تیسرے آدمی نے بھی اندر سرکتے ہوئے کہا۔

میں نے ان لوگوں کے جملے سُن لیے تھے اس لیے جواباً بولا۔

"مجھے احساس ہے کہ میں گدھا ہوں۔ لیکن دوستو! اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے اس بات کا بھی فخر حاصل ہے کہ میں نئی دنیا کا گدھا ہوں۔"

میں جانتا ہوں کہ نئی دنیا کے نام کے اندر نہ صرف بڑی کشش اور بہت جاذبیت ہے بلکہ سر چڑھ کر بولنے والا جادو بھی ہے۔ اس جادو نے ان کو بوکھلا دیا اور وہ تقریباً ایک زبان ہو کر بولے۔ "اوہ! نئی دنیا کے گدھے ہو!"

بڑے صوفے کے کناروں پر بیٹھے ہوئے دونوں لوگ جو مجھے دیکھ کر اندر کی طرف سرک گئے تھے، دوبارہ صوفے کے کناروں پر چلے گئے تاکہ بڑی جگہ بنے اور میں آرام سے بیٹھ سکوں۔ ابھی میں پوری طرح اطمینان کے ساتھ بیٹھا بھی نہ تھا کہ میرے روبرو بیٹھا ہوا آدمی پوچھنے لگا۔

"کیا نئی دنیا کا گدھا بھی گھر اور گھاٹ کے درمیان میں اٹکا ہوا ہوتا ہے؟"

میں اس آدمی کی کم علمی پر ہنسا اور بولا۔

"جناب! یوں لگ رہا ہے کہ آپ نے نئی دنیا صرف نقشے پر دیکھی ہے۔ اس لیے آپ کے پاس نئی دنیا کے تعلق سے نہ کوئی مشاہدہ ہے اور نہ تجربہ۔ نئی دنیا بڑی مختلف دنیا ہے۔ یہاں پر دھوبی گدھے نہیں پالتے۔"

"پھر کون پالتے ہیں؟" ان سب کی پیشانیوں پر ایک ہی سوال تھا۔

"وہاں کی دنیا میں گدھے پالنے والوں کو شاعر کہتے ہیں۔ شاعر کے لیے ایک گدھا رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا پرانی دنیا میں ایک شاعر کے لیے علم عروض سے واقفیت ضروری ہے۔ نئی دنیا میں علم عروض کے بغیر بھی کام چلایا جا سکتا ہے لیکن گدھے کو پالے بغیر کام نہیں چل سکتا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ نئی دنیا کے شعرائے کرام آزاد شاعری اور نثری شاعری کے حامی ہیں۔"

"نہیں نہیں جناب۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "نئی دنیا کے شاعر درجہ بندی کے مخالف ہیں۔ اس لیے آزاد و پابند شاعری، جدید و قدیم شاعری جیسی اصطلاحوں سے ناواقف ہیں۔ شاعری بس شاعری ہے۔"

میرے روبرو بیٹھا ہوا جو تھا آدمی سیاسی ہیر پھیر میں دلچسپی رکھنے والا معلوم پڑتا تھا۔ زور سے اچھلا اور بولا۔ "یاد کرو۔ قصائیوں کی ہڑتال کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے میں نے بتایا تھا کہ پرانی دنیا کا کوئی قصائی اگر نئی دنیا میں چلا جائے تو قصائی نہیں رہے گا بلکہ حلال میٹ کا تاجر —— کتنا معزز نام ہے۔ واہ واہ

اور دیکھو تو سہی کیسی ترقی یافتہ ترکیب ہے۔ وہاں کے جدا طریقے انسانیت کے راستوں کے روشن چراغ ہیں۔"

"ذرا خاموش رہو جانو۔" میرے بازو والے آدمی نے روبرو کے آدمی کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔" تمھاری باتیں سُننے کے لیے ہم تمھاری عمر کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس وقت ہم نئی دنیا کے گدھے صاحب کی معلومات سے استفادہ کرنا چاہیں گے۔"

میرے روبرو بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی نے کہا۔

"جناب گدھے صاحب! آپ شاعر اور گدھے کے سلجھے ہوئے رشتے پر روشنی ڈال رہے تھے۔"

نئی دنیا میں شاعری کی تعریف میں وہ تمام الفاظ اور جملے آتے ہیں جو شاعر کے منہ سے نکلتے ہیں۔ کسی شاعر نے جہاں کوئی بات کی، وہ اس کا کلام ہو گیا۔ انھیں سُن کر واہ واہ کہنا یا شاعر کو آداب کرنے کے لیے اکسانا، دراصل ایک تعظیم ہے جس کو ہماری تہذیب کا حصّہ بن کر رہنا ہے۔"

"یہ تعریف بڑی جامعیت رکھتی ہے۔" میرے بازو والے آدمی نے کہا۔

میں کھنکارا اور آگے بولا۔" شاعر کو اس وقت تک تسکین نہیں ملتی جب تک کہ اسے کوئی واہ واہ کرنے والا نہیں ملتا۔ مکرر ارشاد کہنا اور شاعروں کی آداب قبول کرنا بڑی ادبی خدمت ہے۔ نئی دنیا میں آبادی بہت کم ہے۔ اب جو بھی ہیں، وہ بے ادب ہیں۔ اس لیے شاعروں کو تسکین دینے کے لیے گدھوں سے کام لیا جا رہا ہے۔"

"آپ بہت بڑی سماجی خدمت انجام دے رہے ہیں۔" میرے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

"سماجی خدمت ہی نہیں بلکہ ادبی خدمت بھی۔" میں نے تن کر کہا۔" یہ اب دوسری بحث ہے کہ شاعروں کی صحبت میں رہ کر اکثر گدھے شاعر بن جاتے ہیں اور

گدھوں میں رہ کر شاعر لوگ ڈھینچوں کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نئی دنیا میں سب کے حقوق اور سب کے لیے پورے مواقع حاصل کرنے کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔"

"واہ واہ کیا مثال ہے۔ پرانی دنیا میں ایسی روشن مثال نہیں ملے گی۔ چراغ لے کر ڈھونڈیے تب بھی نہیں ملے گی۔" سامنے بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی نے کہا۔

"تب تو آپ بھی شاعر ہوں گے؟" میرے بازو والے آدمی نے کہا۔

"ہاں، میں بھی شاعر ہوں۔" میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ "اپنی بات کہنے کے لیے جب ایک دنیا مل گئی ہے تو شوق کے پر پھوٹ رہے ہیں۔ شوق اونچی اڑان اڑ رہا ہے۔"

میری باتیں سننے کے بعد وہ لوگ آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے کہ اب وزیر کا انتظار چھوڑ دو، وزیر تو آئے دن ملتے ہی رہتے ہیں لیکن نئی دنیا کے گدھے روز روز نہیں آتے۔ وزیروں سے بہت کچھ حاصل کر لیا۔ چلو اس بار نئی دنیا کے گدھے سے کچھ حاصل کریں۔"

کانا پھوسی ختم ہوئی تو وہ میری جانب پلٹے اور بولے۔

"نئی دنیا سے آئے ہوئے گدھے شاعر صاحب! ہم اس ملک میں آپ کی آمد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ یہاں چلے آئے۔"

میں مسکرایا اور اپنی منڈھی ہلا کر بولا۔

"آپ کی اس گدھے نوازی کے لیے میں آپ لوگوں کا ممنون ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس کا تذکرہ میں اپنے سفر نامے میں کروں گا۔"

"ارے آپ سفر نامہ بھی لکھیں گے۔" وہ چاروں ایک دوسرے کو دیکھ کر اچھل پڑے۔

"ہاں! لکھوں گا" میں نے دوبارہ شرماتے شرماتے کہا۔

انھوں نے پھر کانا پھوسی کی اور اس کے بعد اپنا تعارف کروانے لگے۔

میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص شہر کا مشہور فوٹو گرافر تھا۔ اس نے اپنا نام اور پتہ بتایا اور اپنے بیگ میں سے کیمرہ نکالتے ہوئے بولا۔" میں آپ کی تصویر یوں گا جو کل تمام اخباروں کے پہلے صفحے پر شائع ہوگی۔"

فوٹو گرافر کے برابر میں بیٹھا ہوا آدمی بولا۔" میں یہاں کے مشہور اخبار کا رپورٹر ہوں۔ میں آپ کا انٹرویو لوں گا۔ لوگ میرے لیے ہوئے انٹرویو کو پڑھ کر سر دُھنیں گے۔"

میرے سیدھے بازو شہر کا ایک بڑا کاروباری آدمی تھا۔ وہ ان دونوں کو روکتے ہوئے بولا۔" بھائی یہ اتنا طویل سفر اختیار کر کے یہاں آئے ہیں۔۔۔ اندازہ کیجیے کہ یہ کتنے تھک گئے ہوں گے۔ اس لیے میری صلاح مانیے گا میں انھیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ مہمان نوازی کا تھوڑا سا حق مجھے ادا کر لینے دیجیے۔ یہ میرے مکان پر آرام کر کے تازہ دم ہو جائیں گے۔ شام کو پھر آپ دونوں میرے ہاں آیئے گا اور جتنی چاہیں تصویریں نکالیں، جتنے چاہیں انٹرویو کے لیے سوال پوچھیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

چوتھا آدمی جو سیاسی ہیر پھیر کا نکتہ داں معلوم ہوتا تھا فوراً بولا۔" یوں کرتے ہیں کہ شام میں فوٹو گرافی اور انٹرویو کے بعد ایک چھوٹا سا مشاعرہ بھی رکھ لیں گے۔ اس مشاعرے میں اپنے مہمان گدھے صاحب کا کلام سُنیں گے۔"

سب نے ہامی بھری۔ میں خاموش رہا۔ مجھے بار بار اپنی محبوبہ شہرت کی یاد آتی رہی اور اپنے دل کی ویران وادیوں میں سے اسے آواز دے رہا تھا۔" پیاری شہرت تم کہاں ہو؟ مجھے تلاش کرو۔ میں تمھارا مجنوں ہوں۔ اچھے بھلے آدمی مجنوں بنتے ہیں تو گدھے نظر آتے ہیں۔ میں تو گدھا ہوں ہی اس لیے تمھاری صحبت میں کچھ اور نہیں بن سکا تو دیکھو شاعر تو بن گیا۔ آجاؤ میری پیاری شہرت۔ مجھ سے گلے ملنے کے لیے آجاؤ۔ تمھیں اپنی پیٹھ پر بٹھا کر نئی دنیا کی خوب سیر کراؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ شہرت! شہرت!!"

کاروباری آدمی نے کہا۔ "میرے گھر کے ہال میں پچاس آدمی بیٹھ سکتے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ یہ مشاعرہ ایک پرائیویٹ مشاعرہ ہی رہے۔"

"ہاں میں متفق ہوں۔ بھائی عوامی مشاعرے کے انعقاد کے لیے تو وقت لگے گا اور ہال بھی بڑا اچھا ہے۔"

ان چاروں نے پروگرام طے کر لیا۔

کاروبار والا آدمی کھڑا ہو گیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"آئیے میرے ساتھ۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ میرے بنگلے پر چل کر رہیے، میرے مہمان خانے کی زینت بنیے گا۔ ہم لوگ آپ کی خاطر کریں گے۔ آپ کو آرام دیں گے۔ میرے نوکر چاکر آپ کا خیال رکھیں گے۔

میں اس کاروباری آدمی کے ساتھ ہو لیا۔

وہ کپڑے کی ایک بڑی مل کا مالک تھا۔ ساتھ ساتھ ملک بھر میں دلالی کے دفاتر کھول رکھے تھے۔ اس کا بنگلہ بہت بڑا، کشادہ اور آرام دہ تھا۔ خصوصاً وہ مہمان خانہ جہاں کہ میں ٹھہرایا گیا تھا۔ بالکل کسی خواب کی تعبیر جیسا تھا۔ مجھے اور میرے دوسرے ساتھیوں کو اپنی نئی دنیا میں ایسا مہمان خانہ دم بھر کے لیے بھی کبھی نہیں ملا۔ لیکن یہ بات میں کسی کو کیوں بتا کر اپنی دنیا کا بھرم کھولوں؟

میں جوں ہی مہمان خانے میں داخل ہوا، باہر کی راہداری میں تاجر کی خوبصورت اور نوجوان لڑکی آئی۔ میں نے ایک جھلک میں اسے دیکھا کہ وہ بڑی نازک اندام ہے۔ چہرے سے بلا کی ذہانت ٹپکتی تھی۔ آنکھیں نچا کر شکایتی انداز میں وہ بولی۔

"ڈیڈی، اب ہمارے گھر میں گدھے بھی آنے لگے۔ طرہ یہ ہے کہ وہ ہمارے مہمان خانے میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔"

"ہش ہش! اتنی زور سے نہ بولو۔ خاموش رہو۔" بزنس مین نے اپنی انگلی کو ہونٹ پر لگا کر کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سن لے۔ وہ گدھا نئی دنیا سے آیا ہے۔ درجے میں وہ وزیر سے آگے ہے۔"

" وہ نئی دنیا سے آیا ہے ——— !" اس لڑکی نے بڑے تعجب سے کہا اور اپنے لہجے کو اتنا لمبا کیا کہ اس لہجے کے ساز میں میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی نئی دنیا سے آنا اپنے سر میں سرخاب کے پر لگانے کے مماثل ہے۔

" ہاں ۔"

بزنس مین نے کہا ——— " اور وہ اپنا سفرنامہ لکھنے والا ہے۔ اگر تم اس کی خاطر و مدارات کرو گی اور مہمان نوازی میں اس کے آرام کا ذرا سا بھی زیادہ خیال رکھو گی تو اپنے سفرنامے میں وہ تمھارا ذکر خاص طور پر کرے گا۔ تب نئی دنیا کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے جب تم درخواست دو گی تو یہ کتاب اور اس میں تمھارا نام بطور حوالہ کام آئے گا۔ اس کتاب کے ذریعے نئی دنیا میں تم کو اپنے جاننے والوں کا ایک حلقہ بنانے میں کامیابی ہو گی اور تم بڑی آسانی کے ساتھ اپنی کمپنی کی ایک برانچ وہاں کھول سکو گی۔ برانچ کھل جائے تو میں کم از کم بیس لاکھ روپیوں کو بغیر ٹیکس ادا کیے بلیک سے وائٹ میں منتقل کر سکوں گا۔"

میرے کان بڑے تیز ہیں۔ میں نے سب کچھ سن لیا۔ جب وہ لڑکی خوشی کے مارے تالیاں بجانے لگی تو میں نے اندازہ لگا لیا کہ تاجر کی بیٹی بھی تاجر ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ بار بار دروازہ کھٹکھٹا کر میرے کمرے میں آتی رہی اور پوچھتی رہی۔

" انکل آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ؟"

" انکل ! آپ کو پیاس لگ رہی ہو گی۔ میں آپ کے لیے شربت لائی ہوں۔"

" انکل ! یہ میرے ہاتھ کے تلے ہوئے پکوڑے ہیں۔ آپ چکھ کر بتائیے گا کہ کیسے لگے ———"

اتنی خوب صورت اور نازک اندام لڑکی کا انکل بن کر میں پھولا نہیں سمایا۔ اس نے ہارمونیم پر گیت بھی گا کر سنائے اور اس بات کا وعدہ کیا کہ میری تھکن اترنے پر اس کے اپنے کمرے میں مجھے اپنا رقص دکھائے گی۔ مجھے اپنی تھکن پر بڑا غصہ آیا۔

جب شام آہستہ آہستہ رینگنے لگی تو لوگوں کی آمد شروع ہو گئی جو ایک مخصوص گھریلو مشاعرے میں شرکت کا اعزاز پانے کے لیے سیاست دان، بزنس مین، فوٹو گرافر اور اخبار کے رپورٹر کی دعوتوں پر جوق در جوق آ رہے تھے۔ گھر کا وہ ہال بچاس بچپن آدمیوں کے لیے تھا لیکن وہاں سکڑ سکڑ کر کوئی اسی نوے آدمی بھر گئے تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں، بوڑھے لوگ بھی تھے۔

مجھے لینے کے لیے سیاست داں آئے تو میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"سنیے گا! مجھے ادبی نشستوں کی صدارت کا بڑا شوق ہے۔ اتنا زیادہ شوق ہے کہ اگر اس نشست کی صدارت آپ کسی دوسرے کے حوالے کر دیں گے تو میں احساسِ کمتری کا شکار ہو جاؤں گا۔"

"گدھے صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" سیاست داں نے تنک کر کہا۔ "اس محفل کی نہ صرف آپ جان ہوں گے بلکہ اوّل اور آخر دونوں آپ ہوں گے۔ دراصل میں خود آپ سے خواہش کرنا چاہتا تھا کہ آپ آج کی محفل کی صدارت قبول کریں۔"

ہم دونوں جب مہمان خانے سے نکل رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ باہر کی طرف، کھڑکی کے پردوں کے پیچھے سے کوئی اندر جھانک رہا ہے۔ صورت شکل پوری طرح نظر نہیں آئی لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ میری محبوبہ شہرت ہے۔ اس کو اس شہر میں میری آمد کا پتہ چل گیا ہوگا اب وہ صرف میری تلاش میں ہوگی۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوگی۔

میں نے آہیں بھریں ——— آخر کب تک میں تڑپتا رہوں۔

ہال میں جانے کے بعد میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مسندِ صدارت پر جا کر ڈٹ گیا ———

فوٹو گرافر نے کھٹاک کھٹاک کر کے میری بے شمار تصویریں نکالیں۔ کیمرے کی فلاش سے میری آنکھیں چندھیاتی رہیں۔ لوگوں کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

رپورٹر سامنے آیا۔ اس کے ساتھ ٹی۔ وی کا کیمرہ تھا۔ کیمرے کو مجھ پر فوکس کرتے ہوئے اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"نئی دنیا سے یہاں تک آپ کا سفر کیا کسی خاص پروگرام اور مقصد کے تحت ہے؟"

"ہاں بہت ہی خاص پروگرام کے تحت۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"ہم کو احساس ہے کہ ہمارے ملک کی شاعری غربت اور افلاس کے پس منظر میں اپنی بہار دکھاتی ہے۔ نئی دنیا کی ہماری حکومت کو اس کی اطلاع ہے۔ اس لیے ادب اور تمدن کی حفاظت اور بقا کے نام سے ہماری حکومت ہر سال ایک بڑی رقم کا انتظام کرتی ہے تاکہ ہم ہر بہار میں اپنے چھوڑے ہوئے وطن کے شاعروں کے ایک گروپ کو نئی دنیا کا دورہ کرنے کے لیے مدعو کریں۔ ہم ہر سال یہ پروگرام روبہ عمل لائیں گے اور اسے اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک کہ ہمارے چھوڑے ہوئے اس وطن کے ہر شاعر کو نئی دنیا کی سیر کرنے کا موقع نہ مل جائے۔ جب یہ پروگرام مکمل ہو جائے گا آپ دیکھیں گے کہ اردو ادب میں ایک بڑا انقلاب آئے گا۔ ایسے انقلاب کی مثال کئی سو سال پہلے اور کئی سو سال بعد بھی کسی زبان کے ادب میں نہیں ملے گی۔

نئی دنیا کی بہار اور پرانی دنیا کے شاعروں کی ذہنی بہار کے اجتناب سے جو کیفیت پیدا ہوگی اس میں جادو ہوگا . . . . ."

میں کہتا چلا جا رہا تھا اور لوگ تالیوں پر تالیاں بجا رہے تھے۔

ایسے ہی دو چار سوالات ہوئے جن کے میں نے خوب بڑھ چڑھ کر جوابات دیئے اور تالیوں کے شور میں مَیں مسکراتا رہا۔

پھر شعری محفل کا آغاز ہوا۔

ابھی پچھلے سالوں نئی دنیا میں مَیں نے سرجری کے ذریعے سے اپنے دماغ کو

ایک چھوٹی الیکٹرانک بیٹری جیسی سل میں منتقل کروایا تھا۔ سرجری کی مدد سے ہی اپنی کنپٹی، گھٹنے اور ٹخنوں کے پاس چھوٹے چھوٹے خانے بنوائے تھے تاکہ حسبِ ضرورت اپنے دماغ کو سر سے نکال کر کبھی گھٹنے اور کبھی ٹخنے کے خانے میں رکھ سکوں۔ اس سے فائدہ یہ تھا کہ میرا دماغ کبھی تھکتا نہیں تھا۔ اگر ایک پوزیشن میں تھکن کے آثار محسوس ہوئے تو دماغ کو ایک خانے سے نکالا اور دوسرے خانے میں بند کر کے نئی پوزیشن حاصل کر لی۔

جس وقت مشاعرہ شروع ہوا تو میرا دماغ ٹخنے میں تھا۔ دو تین شاعروں کے بعد مجھ سے فرمائش ہوئی کہ میں اپنا کلام پیش کروں۔

میں نے غالب کی ایک غزل پیش کی۔ وہاں پر زیادہ تر ایسے لوگ تھے جنھوں نے غالب کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس لیے مجھے بڑی فراخ دلی سے داد دیتے رہے۔ دو چار لوگوں نے مرزا غالب نام کی بکچر دیکھی ہوگی اس لیے کسی قدر تجسس کے ساتھ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

ان میں کا ایک آدمی دوسرے سے بولا "یہ غزل مرزا غالب کی ہے۔"

دوسرا آدمی پہلے آدمی کو خاموش کرواتے ہوئے بولا "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ گدھا اپنے پچھلے جنم میں مرزا غالب رہا ہوگا۔ اس لیے پچھلے جنم کی بات اسے یاد آگئی۔"

غالب کی غزل کے بعد جب دوبارہ کچھ سنانے کی فرمائش ہوئی تو میں نے شکیل بدایونی کی ایک رنگین غزل خوب بھڑک بھڑک کر سنائی۔

اس کے بارے میں بھی ذرا سا ایسا ہی ماحول پیدا ہوا۔ پچھلی صف کے ایک آدمی نے تبصرہ کیا۔ "یہ شکیل کی غزل ہے۔"

اس مبصر کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے اس کے کندھے پر زور کی تھپکی دی اور بولا۔ "شکیل کے بہت سے استاد تھے۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ یہ بھی شکیل کے استاد رہے ہوں اور شاگرد نے اپنے استاد کی غزل کو اپنے دیوان میں اپنے کلام کی تصحیح سمجھ کر شائع

کروادی ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ یہ اُستاد اور شاگرد کے اپنے معاملات ہیں۔"
تبصرہ کرنے والا شخص کسمسا کر مُسکرایا اور مُسکرا کر خاموش ہو گیا۔
مشاعرہ بہت رات تک جاری رہا۔ بہت تھک کر میں اپنی خواب گاہ میں گیا۔ خواب گاہ کی کھڑکی کے مہین پردوں کے اس طرف وہی لڑکی نظر آئی۔ اس بار صاف طور پر ٹکٹکی باندھے وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ نظروں کے زاویوں میں بلا کی لجاہٹ تھی۔
آواز نکالے بغیر ہونٹ ہلاتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "تم شہرت ہو؟"
اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔
میں نے بڑی عاجزی اور ترس کھایا ہوا چہرہ بنا کر ہاتھوں کے اشارے سے اندر بُلایا۔ دروازے کی طرف اشارہ کیا کہ اس دروازے سے اندر آجائے۔
شہرت نے ہاتھ کے اشارے سے "نہیں" کہا اور ان ہی اشاروں سے بولی۔ "آج نہیں۔ کل ضرور آؤں گی۔"
میں کھڑکی کے پٹ کھولنے کو اُٹھا تاکہ شہرت کو پکڑ لوں اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے اندر کی جانب کھینچ لوں۔ وہ بھاگ گئی۔
صبح میرے میزبان کی لڑکی نے شہر کے چار مختلف تازہ اخبار میرے سامنے ڈال دیئے۔ سامنے کے صفحے پر میری بڑی تصویر تھی۔ جلی حرفوں میں شائع ہوا تھا۔
"نئی دنیا سے آئے ہوئے ایک گدھے کا لامثال پروگرام۔"
"اُردو شاعری میں گدھے کا لایا ہوا انقلاب۔"
"پرانی دنیا کے اُردو شعراء کو نئی دنیا کی بہار دیکھنے کی دعوت۔"
ان عنوانوں کے نیچے مجھ سے لیے ہوئے انٹرویو کا خلاصہ تھا۔ اخبار دکھانے کے بعد میزبان کی لڑکی نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے ساتھ آؤں اور دیوان خانے کی کھڑکی میں سے باہر کی جانب دیکھوں۔ میں اس لڑکی کے ساتھ دیوان خانے کی طرف ہولیا۔

کھڑکی کے باہر بنگلے کے سامنے لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔مرد زیادہ تھے۔ عورتیں کم تھیں۔مردوں میں لمبے بال رکھنے والے، سوٹ پہننے والے اور لمبے لمبے کرتوں میں بھی لوگ تھے۔ بچّے اور بوڑھے کم تھے۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔"یہ سب کون لوگ ہیں اور یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں۔"

میزبان کی لڑکی نے کہا۔"یہ وہ لوگ ہیں جو ہر صبح اخبار پڑھا کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے آج کا اخبار پڑھا۔ یہ تمام لوگ شاعر ہیں۔جوں ہی اخبار دیکھا اور آپ کے بارے میں پڑھا، آپ سے ملنے کے لیے چلے آئے ہیں تاکہ اپنا نام اور پتہ لکھوا سکیں اور آپ جلد سے جلد انھیں نئی دنیا کی سیر کرنے کے لیے بلالیں۔"

"یہ شہر تو بہت سے شہروں میں ایک شہر ہے۔کیا ایک ہی شہر میں اتنے شاعر؟" میں نے کسی قدر خوفزدہ ہوکر کہا اور بولا۔"کوئی پانچ سو تو ہوں گے ہی۔"

"ابھی تعداد کا آپ تصوّر نہ کریں۔" میرے میزبان کی لڑکی نے کہا۔"یہ تو صرف وہ لوگ ہیں جنھوں نے اخبار کی سرخی دیکھی اور بھاگ کر آگئے۔کئی لوگ دیر سے اخبار پڑھتے ہیں۔ بہت سے لوگ شام کو پڑھتے ہیں۔ دفتروں کو جانے والے دفتر شروع ہونے کے بعد فائیلوں کے نیچے رکھ کر پڑھتے ہیں۔ بستر پر سونے سے قبل پڑھنے والے ہیں اور مانگ کر پڑھنے والے تو ایک دو دن کے بعد بھی پڑھتے ہیں۔ ان پڑھنے والوں میں بھی بہت سے شاعر ہیں۔ ابھی تو یہ لوگ نہیں آئے۔"

میزبان کی لڑکی کہتی جارہی تھی —— پیچھے سے میری محبوبہ شہرت آئی اور آکر میری آنکھیں میچ لیں۔میں نے اسے پہچان لیا اور ان ہاتھوں کو تھپکی دیتے ہوئے بولا۔

"میری پیاری شہرت! آخر تم آگئیں۔"

"پیارے گدھے! تمھاری محبت نے مجھے آنے کے لیے مجبور کردیا تو دیکھو میں آگئی۔" میری آنکھوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا کر وہ لجائی۔میں نے شہرت کا چہرہ

دیکھا۔ کتنا خوب صورت چہرہ ہے۔ اسے پانے کے لیے میرے اندر کتنی تڑپ ہے اور میں نے اتنا لمبا سفر اختیار کیا۔ آخر وہ مجھے مل گئی۔ میں التجائیہ لہجے میں بولا۔ "اب مجھے چھوڑ کر چلی نہیں جانا۔ اس بات کا مجھ سے اقرار کرو۔"

"نہیں جاؤں گی۔ تمھارے ساتھ رہوں گی۔" وہ میرے بہت قریب آکر اپنی نقرئی ہنسی کی چاشنی میں بولی۔ میرے کندھے سے اس کا کندھا لگ گیا۔ اس کے سراپا سے نکلنے والی بھینی بھینی خوشبو میری روح میں سرایت کرنے لگی۔ اس نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں آسمانوں کی سیر کر رہا ہوں۔

"انکل!" میزبان کی لڑکی نے پکار کر میرے استغراق کو توڑا اور بولی۔ "آپ کو باہر جانا ہوگا۔ لوگ آپ کو باہر بُلا رہے ہیں۔ شاعر لوگ آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ انکل وہ بے چین ہو رہے ہیں۔"

"ہونے دو۔" میں نے کسی قدر لاپروائی سے کہا۔

میزبان کی وہ لڑکی ہنسی اور بولی۔ "شاعر جب بے چین ہو جاتے ہیں تو پھر آہیں بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی آہوں سے دھندلکا پیدا ہوتا ہے۔ اگر دھندلکا پیدا ہو گیا اور بڑھ گیا تو آپ شہرت کو نہیں دیکھ سکیں گے۔"

شہرت کو نہیں دیکھ سکنے کے اندیشے سے ہی میں گھبرا گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔" میں شہرت کو اپنے روبرو اور اپنے برابر رکھنا چاہوں گا۔ اس لیے شہرت کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

مجمع ساکت تھا۔ جیسے ٹھہرا ہوا پانی ہوتا ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں کلبلاتے تیرتے کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس مجمع میں خود بخود والنٹیر پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ وہ لوگوں کو اطمینان دلا رہے تھے۔

"آپ لوگ صبر کریں، ڈھنگ سے لائن لگائیں، متوازی لائن ہو۔ دونوں لائنوں کے بیچ درمیان میں راستہ چھوڑیئے گا۔ ہم آپ کی ملاقات گدھے صاحب

سے کرائیں گے۔ آپ نئی دنیا کی بہار ہی نہیں بلکہ وہاں کے چاند تارے بھی دیکھیے گا۔ ان سے آنکھیں ملائیے گا۔ ہم آپ کے لیے دورے کا انتظام کریں گے۔ آپ کا ٹکٹ حاصل کریں گے۔ براہِ کرم آپ اپنا صحیح نام اور درست تخلص ہمارے رجسٹر میں درج کر دیں۔ جن شاعر بھائیوں نے ابھی تک اپنے تخلص کے انتخاب میں کوتاہی برتی ہے وہ آج ہی اور ابھی اس ضرورت کو پورا کرلیں۔ اپنے نام کے آگے اپنا پتہ بھی لکھ دیں۔ پتہ گھر کا ہونا چاہیے، چائے خانے کا نہیں۔"

لوگ صف آرا ہونے لگے۔ ہر دو صفوں کے درمیان میں کافی جگہ چھوڑ دی گئی اور والنٹیر رجسٹر لے کر ہر صف میں گھس گئے۔ اپنے کام کے ساتھ اپنا کمیشن بھی جمع کر رہے تھے۔ تب پتہ چلا کہ وہ والنٹیر دراصل کمیشن ایجنٹ ہیں۔

شہرت کے ساتھ میں باہر نکلا۔ لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں —— وہاں فوٹوگرافر اور اخبار کے رپورٹر بھی تھے۔

اپنی اپنی صفوں میں کمیشن ایجنٹ کہہ رہے تھے۔

"ہماری دی ہوئی گارنٹی کا پہلا حصّہ دیکھیے پورا ہو رہا ہے۔"

ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور شہرت سے باتیں کیں۔ اس کے بعد شہرت نے میرے کان میں کہا۔

"ہماری سہولت کے لیے انتظام کرنے والوں نے چند طریقے بنائے ہیں۔ ہمیں ان طریقوں کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اخبار والوں کو کوئی بیان دینے سے قبل ہمیں صفوں کے سامنے سے گذرنا ہے تاکہ شاعروں کو تسلی ہو جائے۔

شہرت کی رائے سے بھلا میں کبھی اختلاف کر سکتا ہوں۔

نئی دنیا کو ہجرت کرنے سے پہلے میرا مشاہدہ یہ رہا ہے کہ کسی مشاعرے یا محفل میں کوئی شاعر آتا تو محفل کے ختم ہونے پر اس کے شائقین صف بنا کر کھڑے ہوتے اور شاعر ان کے سامنے سے گذرتا، ان سے گفتگو کرتا اور انھیں اپنا آٹوگراف دیتا۔ نئی دنیا کو ہجرت کرنے کے بعد اب معاملہ برعکس ہے۔ شاعروں کی فوج صف بنائے کھڑی

ہے۔ ایک گدھا ان کے سامنے سے مارچ پاسٹ کر رہا ہے۔ شاعر گدھے سے باتیں کرنے کے خواہشمند ہیں، اس کا آٹوگراف لینے کے خواہاں ہیں۔ گدھا انھیں مسکراہٹ دیتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔

ہاتھ ملانے اور آٹوگراف دینے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس لیے گدھا معذرت چاہتے ہوئے گذر رہا ہے۔ لوگوں کے آنے کا سلسلہ جاری ہے۔ نئی لائن ایک کے بعد ایک بنتی چلی جارہی ہے۔

میں اور شہرت اس اونچے چبوترے پر واپس آگئے جہاں سے کہ چلے تھے۔ اخبار کے نامہ نگار آگئے۔ ایک نے سوال کیا۔ "کیا آپ ان تمام شاعر و شاعرات کو نئی دنیا کی بہار دیکھنے کا موقع فراہم کریں گے؟"

میں جواب دینے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔ اس سے قبل کہ میں کچھ کہنے لگوں، شہرت نے ٹوکا اور کہا۔

"پہلے آپ اپنے دماغ کے خانوں کا چیک اَپ کرلیں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی آپ کا دماغ ٹخنے کے خانے ہی میں ہے۔"

میں شہرت کی اس توجہ پر داد دیئے اور اس کا شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ واقعی میرا دماغ گذشتہ رات سے ٹخنے کے خانے میں تھا۔ اسے نکال کر جھٹ پٹ گھٹنے کے خانے میں رکھا۔ سر کا خانہ اب بیکار سا ہوتا جارہا ہے۔ دماغ رکھنے کے لیے میں نے سر کو بہت دنوں سے استعمال نہیں کیا تو اب اس خالی جگہ میں گوشت بڑھ گیا ہے۔ اس لیے دماغ کی الکٹرانک بیٹری اب وہاں ٹکنے والی نہیں ہے۔

اخبار کے نامہ نگار کے سوال کے جواب میں مَیں نے کہا۔ "نئی دنیا کی ہماری حکومت ہماری زبان کے سلسلے میں بڑی مہربان اور ہماری زبان کے شاعروں کے لیے مہمان نواز خصوصیات رکھتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم ایک مخصوص تعداد کو ہی ہر سال دورہ کرنے کی دعوت دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس لیے توقع کی جاسکتی ہے کہ چند سالوں کے اندر اندر تمام شاعروں کو موقع مل جائے گا۔"

خوب زوردار تالیاں بجیں۔ رپورٹر نے دوسرا سوال کیا۔

"جن مقامی اور غیر مقامی شاعروں کو فوراً موقع ملنے کی اُمید نہیں ہے، ان کے لیے کیا کوئی پیام آپ دے سکتے ہیں؟"

"میرا پُر خلوص مشورہ ہے کہ وہ نا اُمید نہ ہوں۔" میں نے کسی بزرگ کی طرح کہا۔ "میں اور وہ شاعر جن کا کہ میں گدھا ہوں، نئی دنیا سے ایک اخبار اور ایک میگزین بھی نکال رہے ہیں۔ اس خدمت میں ہم اس قدر منہمک ہیں اور ہم کو اتنی دلچسپی ہے کہ ہم نے اپنے خاندان کے افراد کو بھی جوڑ لیا ہے۔ ابتدا میں جن شاعروں کو نئی دنیا کے دورے کا موقع نہیں ملا وہ ہمارے پرچوں کے لیے اپنی تخلیقات روانہ کر سکتے ہیں۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ وہاں کے لوگ انھیں پڑھیں گے اور ان اہلِ قلم کے نام و کام سے بخوبی واقف ہو جائیں گے۔ اس کے بعد جب یہ شاعر نئی دنیا کی سرزمین میں قدم رکھیں گے تو یہ جان کر پھولے نہیں سمائیں گے کہ ان کے پرستاروں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود ہے۔"

صف میں کھڑے ہوئے شاعروں نے 'واہ واہ' سے آسمان سر پر اُٹھا لیا' جیسے میری یہ تجویز کسی پُر جوش نظم کا ایک بند ہے۔

کافی دیر تک باہر رہنے کے بعد جب ہم تھک گئے تو اندر آ گئے۔ میرے میزبان اور ان کی لڑکی نے بتایا کہ اس اثنا میں میرے نام وزیروں اور حکومت کے بڑے بڑے عہدیداروں کے فون آتے رہے۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، میرے اعزاز میں جلسے اور عشائیے ترتیب دیئے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اثرات ڈالے جا رہے ہیں کہ میں ان کے بتائے ہوئے نام کے شاعروں کو پہلی فہرست میں رکھ لوں۔

میرے میزبان.... مجھ سے اور میری شہرت سے بڑے خوش تھے۔ جیسے یہ ان کی اپنی کامیابی ہو۔ میرے میزبان کو احساس ہو رہا تھا کہ ان کا مہمان خانہ میری حیثیت سے چھوٹا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس لیے انھوں نے سوچا کہ اب مجھے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ میرے میزبان نے اس بات

کی بھی ذمہ داری لی کہ مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے ایک خوب صورت لڑکی کا تقرر ہوگا... اس کے علاوہ دو لڑکیاں بطور سکریٹری کام کریں گی۔

دوسرے دن کے اخباروں میں بھی میری تصویریں تھیں۔ ہر تصویر میں شہرت میرے ساتھ تھی۔ شاعروں کی تخلیقات کے بارے میں میرے بیان کیے ہوئے جملے شائع ہوئے تھے۔ خبرنامہ کے آخری حصّے میں شاعروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ اپنی ہر تخلیق کے ساتھ ایک سو روپے کا نوٹ، سو روپے کا چیک یا بنک ڈرافٹ منسلک کریں جو تخلیق کی اشاعت کے لیے زیرِ غور فیس ہوگی۔

میری ابرو پر بل پڑ گئے کہ میں نے تو ایسا نہیں کہا تھا لیکن ناشتے کی میز پر شہرت نے بتایا کہ یہ اضافہ میرے میزبان نے شہرت سے صلاح کرنے کے بعد کیا ہے تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ شہرت نے مجھ سے کہا کہ اگر میرا دماغ گھٹنے یا ٹخنے میں ہونے کے بجائے سر میں ہوتا تو میں خود ہی اس اضافے کے بارے میں کہہ دیتا۔ ویسے اپنی رائے کے اظہار طور پر میں نے میزبان کو کہا۔

"پرانی دنیا کے شاعر بہت غریب ہیں۔ انھیں ان کی محنت کا صحیح معاوضہ کبھی نہیں ملتا۔ جریدوں اور اخباروں کے مدیران کے جذبات اور احساسات کے نچوڑ کو مفت میں ہتھیا لیتے ہیں۔ اگر کسی مدیر کو کسی شاعر پر رحم آ گیا تو بیس تیس روپے دے دیئے۔ زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس روپے۔ یہی ان کی معراج ہے۔ اس سے زیادہ کے لیے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے ان کی تخلیقات مفت لینا ہی بڑی بات ہوگی۔ الٹا آپ ان سے سو روپے کی زیرِ غور فیس طلب کر رہے ہیں۔ کیا یہ مناسب ہے؟"

"کیوں نہیں مناسب ہے؟" میرے میزبان نے سوال کے جواب میں سوال کیا اور کہا۔ "نئی دنیا کے میگزین میں اپنی تخلیقات کو شائع کروانا بڑے اعزاز کی بات ہے۔ یہ ایک لاقیمت اعزاز ہے جو اگر سو روپیوں کے بدل میں مل جائے تو خوش نصیبی کی بات ہے — آپ دو چار دن انتظار کر کے دیکھ لیجیے کہ شاعر لوگ

اس سودے کو ہاتھ سے جانے دیتے ہیں یا نہیں۔

میرے میزبان نے بتایا کہ پچھلے دن شاعروں کی صفیں بنانے والے اور کمیشن لینے والے ان ہی کے آدمی تھے۔ ایک دن کے اندر انھوں نے چوبیس ہزار روپے جمع کر لیے تھے۔

پلان کے مطابق ہم شہر کے مشہور اور خوب صورت ہوٹل میں منتقل ہوئے۔ ایک بڑا سوئیٹ میرے لیے اور میری شہرت کے لیے تھا۔ دوسرے سوئیٹ میں میری دو سکریٹریوں کا دفتر بن گیا۔ میرے سوئیٹ کے عین سامنے ملاقاتیوں کا خیر مقدم کرنے والی لڑکی کی سجی ہوئی میز کرسی تھی۔

دو چار دنوں کے اندر ہی مقامی اور غیر مقامی شاعروں کے خطوط آنے شروع ہو گئے۔ خطوط کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی کہ انھیں تھیلوں میں لایا جاتا تھا۔ سارے خطوط رجسٹرڈ ہو کر آتے تھے۔ انھیں حاصل کرنے کے لیے میری سکریٹری دستخط کرتی تھی۔ ہر لفافے میں ایک سو کا نوٹ یا سو روپے کا بنک ڈرافٹ ہوتا۔ میری سکریٹری انھیں علیحدہ کر کے بنک اکاؤنٹ میں جمع کر دیتی اور تخلیقات کی فائیل بناتی۔ ہر روز کوئی آٹھ دس فائیل میری توجہ کے لیے میرے سامنے آتے۔ دوپہر، سہ پہر اور رات کے اوقات لنچ، عصرانے، ڈنر اور عشائیوں کی دعوتوں میں گذرنے لگے۔ گذرتے ہوئے دنوں کے دوران میری محبوبہ شہرت کا رنگ نکھر رہا تھا۔ بال زیادہ لمبے اور چہرے کے نقوش زیادہ خوب صورت بن رہے تھے۔ ابرو سنورتے چلے جا رہے تھے۔ پورا سراپا نزاکت کا پُتلا بن گیا تھا۔ آئی ہوئی غیر مقامی تخلیقات میں سے میری شہرت اچھے کلام کو تلاش کرتی اور ادبی محفلوں میں مَیں اس کلام کو اپنے نام سے پڑھ کر داد لوٹتا رہا۔ کئی ہفتے اتنی تیزی سے گذر گئے کہ جیسے پَل پَل بن گئے ہوں۔

میرا ویزا ختم ہونے لگا۔ شہرت کو اپنے ساتھ لیے میں نے واپس لوٹنے کے انتظام کیے۔ میں اپنی محبوبہ کا متلاشی تھا جو مجھے مل گئی۔ یہ کتنی بڑی خوشی کی بات ہے۔

اب مجھے بھلا کیا چاہیے! میں نے اپنا سامان باندھا۔ شہرت سے میں نے وعدہ کیا کہ اسے لے کر نئی دنیا کے تمام خوب صورت شہروں کی سیر کروں گا۔ اسے یہ احساس دلاؤں گا کہ ایک گدھا بھی جب کوئی کام کرنے پر تل جاتا ہے تو اسے سرانجام تک پہنچا دیتا ہے۔ شہرت کو میں اپنے گدھے پن کی عظمت کا معترف کراؤں گا۔

مجھے وداع کرنے کے لیے ایئرپورٹ کی لابی میں بڑا ہجوم تھا۔ چھوٹے بڑے شاعر، اداکار، اداکارائیں، موسیقار، تاجر اور کالج کے طلبا و طالبات، ایئرپورٹ کے باہر ایک بڑا اژدہام بھی تھا جس کی ایک ملی جلی آواز آرہی تھی جو بڑی مبہم تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ دراصل مجھے پکار رہے تھے۔ ان میں سے چار آدمی ان کے نمائندے بن کر آئے اور مجھے بتایا کہ وہ لوگ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایئرپورٹ کی سیکورٹی کے باعث پولیس والوں نے انھیں دور باہر ہی روکے رکھا تھا۔

میں ایئرپورٹ کے باہر آگیا اور لوگوں کے سامنے ان کے نمائندوں سے گفتگو کی جو یوں تھی۔

"آپ نے اپنے قیام کے دوران کئی موقعوں پر بتایا کہ نئی دنیا میں ہر شاعر کا کم ازکم ایک گدھا ہوتا ہے۔"

"ہاں بتایا تھا۔" میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "میں بھی ایک شاعر کا گدھا ہوں۔"

"ہر سال شاعروں کی بڑی تعداد کو آپ نئی دنیا کی سیر کرنے کے لیے دعوت دیں گے؟"

"ہاں مجھے اس بات سے بھی انکار نہیں ہے۔"

"تب جتنے شاعروں کو آپ مدعو کرتے ہیں کم ازکم اتنے گدھوں کو بھی دعوت دیں تاکہ وہاں کے رواج کی پابندی ہوتی رہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ "رواج کو برقرار رکھنا اچھی بات ہے۔ میں مانتا ہوں۔ لیکن آپ لوگ اس بارے میں کیوں فکرمند ہیں؟"

"اس کی وجہ ہے۔" ان لوگوں کے نمائندوں میں سے ایک نے کہا۔

"کیا؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"ہم گدھے ہیں۔" وہ بولے۔

میں ہنسا اور بولا۔ "غالباً نئی دنیا کی سرزمین میں قدم جمانے کی غرض سے ایسی بات کہہ رہے ہو۔"

"نہیں۔ دراصل ہم آدمی کا لبادہ اوڑھے ہوئے گدھے ہیں۔ اگر آپ ہمیں نئی دنیا میں آنے کی کوئی ترکیب بتائیں یا ہماری مدد کریں تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نئی دنیا کی سرحد میں داخل ہوتے ہی ہم آدمی کے لبادے کو پھینک کر اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھیں گے۔"

مجھے احساس ہوا کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ یہ احساس مجھے اس لیے ہوا کہ نئی دنیا میں آنے سے قبل میں بھی ان کے زمرے کا ایک مہرہ تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے امیگریشن کے قوانین کی زیادہ جانکاری حاصل نہیں کی۔ اگر میں امیگریشن کا وکیل ہوتا یا کسی وکیل کا ماتحت ہوتا تو ان لوگوں کو نئی دنیا کے اندر آنے کے قانونی یا غیر قانونی نکتے بتا کر خوب فیس کما لی ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ نئی دنیا میں پہنچنے کے بعد ایسے کسی پروگرام کو روبہ عمل لا سکوں۔ فی الحال میں نے انھیں تسلّی دی اور اطمینان دلایا کہ اپنے شاعر سے صلاح کر کے ان کے لیے کوئی عملی تجویز تلاش کروں گا اور بہت جلد دوبارہ آؤں گا، ان کے لیے ہی آؤں گا۔ میں نے کھلے عام وعدہ کر لیا۔

میرے دل سے نکلی ہوئی بات میں شاید ان کے لیے تسلّی اور صبر کر لینے کے سامان تھے۔ وہ مطمئن نظر آ رہے تھے۔ میں واپس پلٹا۔

جب میں اور میری محبوبہ شہرت ہوائی جہاز کی سیڑھیاں چڑھنے کے لیے آگے بڑھے تو چھوڑنے کے لیے آئے ہوئے سب لوگ پیچھے رہ گئے۔ ہم پلٹ پلٹ کر ان کے لہراتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے جو ہم کو وداع کر رہے تھے۔

جہاز کے اندر داخل ہو کر بڑی شان و تمکنت سے میں اپنی سیٹ تلاش کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ میرا حق ہے کہ میری شہرت میرے بازو میں رہے۔

اپنے حقوق کی بات میں نے جہاز کے عملے سے کی۔ ایک ہوائی میزبان نے شہرت کو بڑے روکھے پن سے دھکّا دیا۔ میں نے پلٹ کر شہرت کو دیکھا۔ شہرت کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی ۔۔۔۔ وہ سسک رہی تھی۔ میں نے شہرت کو تسلّی دی ۔
" برداشت کرلو میری جان ۔ میری خاطر برداشت کرو۔ گنتی کے گھنٹوں کی بات ہے۔ پھر ہم نئی دنیا کی سرزمین پر ہوں گے ۔ میں تمھیں لے کر خوب گھوموں گا۔"

دل شکستہ نظر آتی ہوئی شہرت مجھ سے دور ایک سیٹ پر بیٹھی رہی۔ اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے میں نے دوبارہ کوئی آواز نہیں اُٹھائی۔ کون جانے اس کا اثر شہرت پر کسی مار کی شکل میں نہ پڑے ۔ ہاں پلٹ پلٹ کر شہرت کو دیکھتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے مجھے غنودگی سی آنے لگی ۔ میں نے دیکھا کہ میرے پنکھ پھوٹ گئے ہیں اور میں آسمان میں اُڑ رہا ہوں۔ نیچے نئی دنیا کے شہر ہیں اور میں ان شہروں کے اوپر اُڑ رہا ہوں ۔ میری پیٹھ پر شہرت ہے ۔ وہ بڑی خوش ہو رہی ہے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پری بن گئی ۔ پھر وہ میری پیٹھ پر کھڑی ہو گئی ۔ اپنی خوشی کا اظہار کرنے کی خاطر اپنے ہاتھ ، گردن اور کمر کو لچکا کر رقص کرنے لگی۔ کبھی ایک پاؤں ٹیک کر دوسرے پاؤں کو ہوا میں لہراتی ۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک خوشگوار گیت بھی آ گیا۔ میں دیکھ رہا ہوں، محسوس کر رہا ہوں اور ایک اندرونی مسرّت کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ یوں خواب دیکھتے دیکھتے وقت گذر گیا۔

ہوائی جہاز نئی دنیا کی سرزمین پر بیٹھ گیا۔ لوگ اُترنے لگے لیکن میں شہرت کے لیے کھڑا رہا۔ تمام لوگ اُتر گئے ۔ میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شہرت وہاں نہیں تھی ۔ لوگوں کی قطار پر آ کر شاید وہ بھی اُتر چکی تھی ۔ اس لیے عجلت کے ساتھ میں نے بھی ہوائی جہاز سے باہر نکلنے کی راہداری لی ۔

ائیرپورٹ کے تمام قواعد پورے کرنے کے بعد جب میں بڑی لابی کی طرف نکلا تو میرے حواس اُڑ گئے ۔ میں نے جو کچھ دیکھا ، اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں ۔ وہ شاعر جس کا کہ میں گدھا ہوں ، وہاں پر آیا ہوا تھا لیکن وہ

گدھا بنا ہوا تھا اور میری محبوبہ پری بن کر اُس کی پیٹھ پر رقصاں تھی۔ وہ میری محبوبہ کو اپنی پیٹھ پر لے کر بار بار ڈھینچوں کر رہا تھا۔ اچھل رہا تھا۔ کود رہا تھا۔ شہرت بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ کھلی جا رہی تھی۔ میں نے اشارے سے شہرت کو بلایا۔ اس نے اشارے سے جواب دیا کہ وہ نہیں آئے گی۔ مجھے اصرار تھا کہ وہ آ جائے۔ اس لیے زوردار آواز میں بولا۔ "تم میری محبوبہ ہو۔ تمھیں میں نے تلاش کیا ہے۔ تم کو پرانی دنیا سے اُٹھا کر نئی دنیا میں لے کر آیا۔ یہاں آنے کے بعد مجھے چھوڑ کر دوسرے کی پیٹھ پر جا کر یوں خوشی کا اظہار کرنا مجھ پر غم کا پہاڑ توڑنے کے برابر ہے۔ تم نے میرے سنہرے خواب کو پائمال کر دیا۔ کیا تمھیں اپنی اس بے مروّتی اور بد اخلاقی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔"

"میرے سابق پیارے گدھے۔" شہرت نے شاعر کی پیٹھ پر سے جواب دیا ــــ "بے مروتی اور بد اخلاقی کا احساس تم کو ہونا چاہیے۔ مجھے نہیں۔"

"مجھے؟ کیوں؟ کیوں؟" میں نے بڑے تذبذب اور بڑی حیرانی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ تمھارے شاعر نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم ان کے دیئے ہوئے ٹکٹ پر اور ان سے لی ہوئی ہدایت پر پرانی دنیا کی مہم پر گئے تھے۔ تب تمھاری حاصل کی ہوئی چیز تمھاری کیسے ہوئی۔ یہ تو اس کی امانت ہوئی جس نے تمھیں سفر کا خرچ دیا اور ہدایت دی۔"

اور وہ شاعر جو شہرت کو پیٹھ پر بٹھانے کی خاطر گدھا بن گیا تھا، خوب اُچھلا۔ شاید شہرت کو اس اُچھل کود سے گدگدی سی لگ رہی تھی۔ وہ مسلسل ہنسے چلی جا رہی تھی۔ پھر چوکڑیاں بھرتے ہوئے وہ شاعر باہر کی طرف بھاگ گیا۔

آنکھ میں آنسو لا کر میں نے سوچا کہ کاش میرا دماغ گھٹنے میں ہونے کی بجائے سر میں ہوتا، تب میں نئی دنیا کے اس شہر میں اُترنے کی بجائے کسی دوسرے شہر میں اُتر گیا ہوتا اور اس گدھا بنے ہوئے شاعر کو میرا اور میری شہرت کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

شگاف

یادوں کے گھاؤ اور خوابوں کا لہو لیے ایک بن کھلی، مُرجھائی ہوئی، اُداس کلی آہستہ آہستہ اُس چٹان کی طرف جانے لگی، ڈرتا ہوا چاند دُور کی پہاڑیوں کے اوپر سے کھنڈالہ کی بھیانک پُرشگاف گھاٹیوں میں جھانکنے لگا۔ پھر ذرا بے خوف ہو کر اوپر آیا تو غور سے دیکھا۔ وہی چھوٹا سا میدان تھا جس کے تین طرف مہیب پہاڑیاں تھیں۔ چٹان ویسی ہی تھی۔ ہریالی ویسی ہی تھی۔ چٹان سے چند گز کے فاصلے پر ایک جنگلی پھول کا پودا ابھی جوں کا توں تھا۔ چاندنی سلگ سلگ کر گر رہی تھی، پہاڑیاں چمک رہی تھیں۔

پریتی آہستہ آہستہ چٹان کی طرف بڑھنے لگی۔ چٹان کے قریب آئی تو اُس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ اس کی آواز سُنائی دینے لگی۔

"میری راتوں کے چاند! تمھیں روپوش ہوئے ایک برس ہو گیا۔ یہی سرد پورنیما کی رات تھی، ایک برس بعد جو آج آئی ہے۔ گزشتہ سال میرے ساتھ تم تھے۔ ہربیل! اُس رات نے میرے سر کا تاج بننے کی قسم کھائی تھی اور اُسی رات تم نے مجھے جُدائی کا داغ دے دیا۔"

پریتی بہت دیر تک روتی رہی۔ بہت دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ چاند کرنیں بکھیرتا ہوا منزلیں طے کرنے لگا۔ جیسے پریتی کے لیے آسمان کی گہرائیوں میں ہربیل کو ڈھونڈ رہا ہو۔

پریتی نے سر اٹھایا۔ سسک کر بولی۔ "میری کنواری باہوں میں جو تمنائیں سُلگ رہی تھیں، میں نے اُن کا واسطہ تمھیں دیا تھا۔ لیکن آہ تم چلے گئے ہربیل!"

سسکیاں لیتی ہوئی پریتی بہت دیر تک کھوئی رہی۔ ہاتھ کے سہارے سے سر کو جھکا لیا۔

چاند عین اوپر آگیا۔ ایک جسم سایہ کی طرح اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا نظر آنے لگا۔ اپنے ہاتھوں کو کھولے جیسے اس کی باہیں کئی برسوں سے کسی کو پالینے کے لیے تشنہ ہیں اور اب اس پُرانی تشنگی کو تشفی دینے کا کوئی وسیلہ ملنے والا ہے۔

سایہ بہت قریب ہوگیا۔ پاؤں کی آہٹ ہوئی۔ پریتی نے سر اُٹھایا تو سایہ بولا۔ "میں ہربیل ہوں۔ تمھارے لیے آگیا ہوں پریتی!"

پریتی چونکی۔ ڈری نہیں۔ کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

"تم ہربیل ہو؟ کس کے ہربیل ہو۔"

وہ رُک رُک کر بولا۔ "تمھارا ہربیل ہوں۔ پریتی کا ہربیل ہوں۔ پریتی! میں ہربیل ہوں۔ تمھاری سال بھر کی تڑپ کا حاصل ہوں۔"

"میں اپنے ہربیل کے لیے پاگل ضرور ہوگئی ہوں۔ میری آتما کی بے قراری انتہا کو پہنچی ہوئی ہے لیکن ہربیل کو پہچاننے کے لیے میرے پاس ابھی ہوش باقی ہے۔ تم کسی اور پریتی کے ہربیل ہو۔ تمھارے ہوش سلامت ہیں تو اپنی پریتی کو ڈھونڈھ لو۔"

"میں تمھارا ہی ہربیل ہوں۔ تمھاری آواز سُن کر میں آیا ہوں۔"

"میرا ہربیل کئی سو فٹ نیچے اس گھاٹی میں گرا ہے۔ اُس کنارے کے لوگوں نے چاند کی روشنی میں کئی سیکنڈ تک اُسے گرتا ہوا دیکھا ہے۔ میری چیخ اس ماحول

میں ابھی تک زندہ ہے۔ تم سُننے کی کوشش کرو تو سُن سکتے ہو۔ ہربیل کی لاش بھی نہیں ملی۔ اس کا بدن بھی کھو گیا۔

"پیار جو کرتی ہے وہ آتما ہوتی ہے پریتی!۔ بدن ایک محل ہے جس میں آتما رہتی ہے۔ اس محل میں رہ کر ہی وہ آواز دیتی ہے۔ اپنے کام کرتی ہے۔ میں جب اتنی بلندیوں سے گرا تو میری آتما میرے بدن سے الگ ہوگئی۔ مادی جسم نیچے گرا اور میری آتما اوپر اُٹھی۔ تمھاری دلدوز چیخ نے میری آتما کی اوپری پرواز کو روک دیا۔ اس لیے میرے جسم کے محل کی قید سے نکلنے کے بعد میری آتما تمھاری تڑپ اور تمھاری آرزو میں قید ہوگئی۔ میں بہت دنوں تک تمھارے آس پاس بھٹکتا رہا، تمھاری آہیں سُنتا رہا اور تمھیں مخاطب کرنے کی بے سود کوششیں کرتا رہا۔ تمھاری آہیں میرے ایک دوست پردیپ نے بھی سُنیں۔ تمھارے صدمات کا اسے بھرپور احساس ہوا تو اس نے چاہا کہ اُسے میری آتما مل جائے تاکہ وہ میری آتما کو اپنا جسم دیدے۔ پردیپ کی تمنّا نے چلا کر مجھے بلایا اور ہم دونوں کی آتماؤں میں یہ سمجھوتہ ہوگیا کہ اُس کے بدن میں میری آتما قید ہوجائے گی اور پردیپ کی آتما وہاں چلی جائے گی جہاں میری آتما کو چلا جانا چاہیے تھا۔"

"سمجھی۔ مجھے دلاسہ دینے کے لیے پردیپ آئے ہیں۔ ہربیل کے دوست! اس مہربانی کا بہت شکریہ۔"

"دلاسہ دینے کے لیے پردیپ نہیں آیا ہے" اُس آدمی نے جواب دیا" بلکہ خواب کی تعبیر لینے ہربیل آیا ہے۔ یہ جسم پردیپ کا ہے لیکن اندر جو دوبارہ آتما قید ہوگئی ہے وہ میری ہی ہے یعنی کہ ہربیل کی آتما ایک دوسرے جسمانی محل میں سے تمھیں آواز دینے کے لیے دوبارہ آگئی ہے۔

"میں کیسے یقین کرلوں کہ ایسا ہوسکتا ہے۔" پریتی نے سسکتے ہوئے کہا۔ "کاش یوں بھی ممکن ہوتا۔"

"تمھارے پیار کی قوت نے اُسے ممکن بنادیا ہے پریتی۔ میری بات کا یقین کرلو۔

آتما کا سہارا لے کر پیار اور محبت کی باتیں کرتے ہیں تو جھوٹ نہیں بولتے۔"
"میرا دل نہیں مانتا۔" پریتی نے اُسی اُداس لہجے میں کہا۔" آتما دوسرا جنم لے کر جسم بدل سکتی ہے۔ دوسرا جنم لیے بغیر جسم نہیں بدلتی۔ میں مان نہیں سکتی۔"
"میری کھلی ہوئی بانہوں میں آجاؤ پریتی۔ میں تمھیں اپنی بانہوں کے حلقے میں لے کر ایک بار یوں ہی لپٹ جاؤں گا جیسے کوئی پھول کی بیل کسی سہارے سے لپٹی ہے، میری آتما تمھاری آتما سے اتنی قریب ہو جائے گی تو تم مجھے پہچان لو گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہر بیل کو پہچان لو گی۔"
"کوئی ثبوت اس طرح کہیں دیا جاتا ہے؟" اپنے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے پریتی نے کہا۔
"تم ہمیشہ کی طرح ضد کرتی ہوئی پریتی ہو۔ میرے وجود کا ثبوت چاہتی ہو نا؟"
"ہر یقین کے اطراف بہت سے ثبوت بکھرے ہوئے ہیں۔"
"میں جس بات کا تمھیں یقین دلا رہا ہوں پریتی! اُس یقین کے اطراف بھی بہت سے ثبوت بکھرے ہوئے ہیں۔"
"تو آؤ۔ گزشتہ سال کی تھوڑی سی باتوں کو یاد کریں تاکہ ماضی اور حال کو قریب کر کے جوڑ دیں۔ انھیں جوڑ دینے کے بعد ہم مستقبل کی باتیں کریں گے۔"
"ہاں! ماضی اور حال کے درمیان ایک شگاف ہے۔ میری آتما کے کھو جانے کی بات ایک تسلسل میں شگاف کی طرح ہے۔ میں اس خلا کو پاٹنے کے لیے گزشتہ سال کی باتوں کو یاد کروں گا۔ میں کہتا جاؤں گا اور تم سنتی چلی جانا۔ میں جھوٹ بولوں تو تم ٹوک دینا۔ میں کہتا ہوں کہ تم ایک بار بھی نہیں ٹوک سکو گی۔"
دونوں خاموش ہو گئے جیسے دونوں اپنے اپنے ذہن پر بار ڈال کر ایک آزمائش سے ٹکر لینے کا ولولہ پیدا کر رہے ہوں۔
دونوں چٹان کے اطراف کھڑے تھے۔ ہر بیل کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ بولنے لگا۔
"جب چاند گزشتہ سال یوں سر کے اوپر تھا، ہم دونوں چٹان پر بیٹھے تھے۔"

"ہاں"

"تم نے کہا تھا' دیکھو اس چاند اور چٹان کے درمیان صرف ہم دو ہیں اور کوئی نہیں۔ تم ایسی ہی سفید ساڑی پہنی ہوئے تھیں۔ تمھارے بال شانوں پر یوں ہی بکھرے ہوئے تھے۔ میرے جسم پر یاد ہے وہ لال بش شرٹ تھا جس کا رنگ تمھیں اچھا لگتا تھا۔"

"ہاں مجھے وہ یاد ہے۔" پریتی نے سسک کر کہا۔

"چٹان پر بیٹھے تھے تو اس انداز سے کہ ہمارے بدن بہت قریب تھے۔ میرا دایاں ہاتھ تمھاری کمر کے اطراف تھا"

"ہربیل ہو تو بتاؤ آگے کیا ہوا تھا۔"

"ہم نے اپنے اطراف دیکھ کر اِس بات کا احساس کرلیا تھا کہ ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔"

"ہاں۔"

"تم نے آہستہ سے کہا تھا کہ تم نے اپنے ارمانوں اور وفاؤں کو مرکز بنا کر ایک گیت لکھا ہے جو آج اس موقع پر سُنانا چاہتی ہو۔"

"ہاں کہا تھا۔"

وہ ہربیل اس چٹان پر بیٹھ گیا، بالکل یوں ہی جیسے گزشتہ سال بیٹھا تھا اور وہ گیت دہرانے لگا۔ جب گیت کے بہت سے بول جوں کے توں گائے۔۔ تو بے اختیار طور پر پریتی بھی اس کے قریب آ گئی اور ایامِ گزشتہ ہی کی طرح خود بھی بیٹھ کر آواز میں آواز ملانے لگی۔

گیت ختم ہوا تو دونوں ذرا سا رُکے۔ دوسرے لمحے ہربیل بولا۔

"گیت کے اختتام پر تم نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا تھا۔"

"آتما کی باتوں میں جھوٹ نہیں ہوتا ہے نا؟" پریتی نے آہستہ سے اپنا سر اُس ہربیل کے کندھے پر رکھ دیا۔

"ہاں بالکل یوں ہی۔ ذرا بھی تو فرق نہیں ہے۔"

"میرا دل اکسا رہا ہے مجھے یہ گواہی دینے کے لیے کہ تمھارے اندر ہربیل کی آتما ہو سکتی ہے۔ ایک کشمکش ہو رہی ہے اندر، اس لیے میرے یقین کو ابھی مہلت چاہیے۔ ماضی کی باتیں کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ آگے بتاتے جاؤ۔"

"تمھارا سر میرے کندھے پر تھا اور ہم کھو گئے تھے، وقت کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ میں اپنی خاموشی میں کھو کر دراصل اُن وفاؤں کے وعدوں کو یاد کر رہا تھا۔ جس کی ایک مضبوط کڑی ہم نے یہیں چند گھنٹوں قبل ڈالی تھی۔"

"میں بھی کھو کر وہی سوچ رہی تھی۔"

"ہم نے اپنی شادی کی تاریخ بھی تب ہی طے کی تھی۔" ہربیل نے رُکے بغیر کہا۔

اچانک ہربیل چونکا۔ پریتی بھی چونکی۔ ہربیل بولا۔

"دیکھا! ہَوا کا ایسا ہی جھونکا آیا تھا اور دیکھو اسی طرح اُس پودے سے ایک بڑا سا پھول ٹوٹ کر ہماری جانب لڑھکتا ہوا آکر گرا تھا۔"

"ہاں۔"

"تب میں نے تم سے کہا تھا کہ پریتی چاند نے بگولے کے ذریعے یہ پھول تمھارے بالوں میں میرے ہاتھ سے لگانے کے لیے بھیجا ہے۔ تم نے جواب دیا تھا کہ تب دیر کس بات کی ہے۔"

ہربیل چٹان سے اُٹھنے لگا اور بولا "یاد ہے؟ میں تب اُٹھا تھا اور پھول کی جانب بڑھا تھا۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پھول اٹھا کر ہربیل نے اُسے چوما تھا۔"

"تم نہیں دُہراؤ۔ مجھے دُہرانے دو۔" ہربیل نے پھول کو چومتے ہوئے کہا۔ پھول کو اپنے ہاتھ میں لیے آگے بڑھا۔ پریتی چٹان پر بیٹھی تھی۔ پھول کو ہتھیلی پر رکھ کر اس نے پریتی کے سامنے کیا۔ پریتی نے پھول کو اُٹھا کر چوما اور واپس ہتھیلی پر رکھا۔ ہربیل نے ہاتھ کو اونچا کیا جیسے چاند کو بتا رہا ہو۔

"ہاں ہاں یوں ہی تم نے ہاتھ اونچا کیا تھا" پریتی بولی۔ دفعتاً دوبارہ ایک تیز جھونکا آیا۔ پھول کو ایک زوردار دھکا لگا اور وہ اُڑ کر بہت دور جا گرا۔

"اس پھول پر تمھارے اور میرے ہونٹ ثبت ہوئے ہیں۔ میں اُسے گم نہیں ہونے دوں گا۔ اُسے تمھارے بالوں میں مہکنا ہوگا"

"میرا دل دھڑک رہا ہے یوں ہی کہا تھا" پریتی چیخی۔ "لیکن بھگوان کے لیے اس بار پھول کے پیچھے نہ بھاگو۔ حال اور ماضی کا شگاف پُر ہو گیا ہے۔ میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔

ہربیل تیزی سے پھول کے پیچھے بھاگا۔ ایک جھونکا دوسرا بھی آیا۔ پریتی چلا رہی تھی۔ "ہربیل! میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ واپس آجاؤ۔ اُس جگہ پاؤں پھسلتے ہیں ہربیل! تمھاری پریتی نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ اتنی دُور نہیں جاؤ۔ اتنی دُور نہیں جاؤ ہربیل! میرے پیار کی قسم پلٹ جاؤ۔ میں تڑپ رہی ہوں تمھیں پا کر کھو دینا اس بار میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ ہربیل! ہربیل — ہربیل —"

اُس بھیانک شگاف کی دوسری جانب دور سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے لوگوں نے کہا کہ گزشتہ سال کی طرح اس برس بھی عین جب چاند سروں کے اوپر تھا ایک لاش اس گھاٹی میں گری۔ چند سیکنڈ تک وہ روشنی میں چمکتی ہوئی کئی سو فٹ کی بلندی سے گرتی ہوئی دکھائی دی اور لاپتہ ہو گئی۔ ہاں ایک دلسوز چیخ کی آواز بہت دیر تک بہت دور سے آتی رہی۔

اشتباہ کی آگ تلے

نیویارک شہر کے وسطی علاقے من ہاٹن کے مشرقی حصے میں کھڑی ہوئی ایک اونچی رہائشی بلڈنگ کے ایک اپارٹمنٹ میں فون کی گھنٹی بجی۔ ۳۲ سالہ ڈاکٹر جارج لمبارڈی اتفاق سے اس دوپہر کے وقت گھر پر ہی تھے۔ انھوں نے فون کا چونگا اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"کیا میں ڈاکٹر جارج لمبارڈی سے گفتگو کر سکتی ہوں؟"

"جی ہاں!" ڈاکٹر لمبارڈی نے جواب دیا "آپ ان ہی سے گفتگو کر رہی ہیں۔"

"ایک ۹، سالہ خاتون ہیں جو تیز بخار میں مبتلا ہو کر پڑی ہوئی ہیں۔ بخار اتر نہیں رہا ہے۔ وہ خون کی قے کر رہی ہیں۔ ان پر بار بار غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ شکایت کر رہی ہیں کہ ان کا سر بھاری ہے اور چکر جیسی کیفیت محسوس کرتی ہے۔ ان کی حالت دن بہ دن خراب ہو رہی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ انھیں آپ کی مدد ملے؟"

"یہ مجھے ایمرجنسی کیس لگ رہا ہے" ڈاکٹر لمبارڈی نے سرد لہجے میں کہا۔ "انھیں کسی قریبی ہسپتال میں فوراً داخل کریں۔ وہاں کے ڈاکٹر اُن کی دیکھ بھال کر لیں گے۔"

"وہ ہسپتال ہی میں داخل ہیں ڈاکٹر لمبارڈی اور ملک کے نامور ڈاکٹر ان کی

نگہداشت کر رہے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے علاج میں کہیں کوئی چھوٹی سی بات رہ گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتنے ڈاکٹر مل کر بھی ان کے مرض کی تشخیص ہی ٹھیک طور پر نہیں کر رہے ہوں۔"

"دیکھیے میڈم" ڈاکٹر جارج لمبارڈی نے گفتگو کو ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ "آج سنیچر ہے اور ۹ ستمبر۔ اگر آپ انھیں منگل کے دن یعنی ۱۲ ستمبر کو دوپہر کے بعد میری ڈسپنسری پر لے آئیں تو ان کا معائنہ کرنے کے بعد ہی میں اپنی کوئی رائے دے سکتا ہوں۔ پیر کے دن آپ میری سکریٹری کو فون کر کے مناسب وقت طے کر لیں۔"

"وہ آپ کی ڈسپنسری پر نہیں آسکتیں ڈاکٹر۔" اس نسوانی آواز نے تیز تیز لہجے میں کہا "کیونکہ وہ کلکتہ کے وڈلینڈ نرسنگ ہوم میں ہیں۔"

"کلکتہ؟ ہندوستان؟" ڈاکٹر لمبارڈی کے سوال میں حیرت اور جھنجھلاہٹ کا آمیزہ تھا۔

"جی ہاں ہندوستان" وہ نسوانی آواز آئی "اور اس مریضہ کا نام مدر تھریسا ہے۔"

"مدر تھریسا! مدر تھریسا!" لمبارڈی نے نام دہرایا، حیرت بڑھی اور جھنجھلاہٹ کی جگہ دلچسپی آئی۔ انھوں نے آگے کہا "جنھیں پچھلی بار نوبل پرائز برائے امن دیا گیا تھا۔ ساری دنیا انھیں ایک فرشتہ صفت انسان کے طور پر پہچانتی ہے۔ انھوں نے غریبوں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ میڈیم کیا کیا آپ یہ فون کلکتہ سے کر رہی ہیں؟"

"نہیں۔ طویل فاصلے کا یہ فون میں روم سے کر رہی ہوں۔" اس نسوانی لہجے میں اس بار بڑا جوش و خروش تھا جیسے ڈھونڈنے پر انھیں امید کی کرن مل گئی ہے۔ وہ آگے بولیں "مدر تھریسا انسانیت کا روشن چراغ ہیں۔ یہ چراغ جب بھڑکنے لگا تو دنیا کے اطراف مختلف جگہوں پر رہنے والے بہت سے لوگ اپنے اپنے طور پر کوشش

کررہے ہیں کہ یہ چراغ بجھنے نہ پائے۔ میں امریکہ کے بہت سے نامور ڈاکٹروں سے ربط قائم کیے ہوئے ہوں اور ٹٹول رہی ہوں کہ ان میں سے کون کون ان کی مدد کرسکتا ہے۔ مجھے آپ کے نام کا حوالہ بھی ملا ہے کہ آپ بہت سے موسمی بخار اور کسی تغیر کے ردِ عمل سے پیدا ہونے والی تپش کو قابو میں لانے کے لیے مہارت رکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر لمبارڈی نے محسوس کیا کہ ان کے لیے کوئی بہانا بنانا یا انکار کرنا بڑا مشکل ہے۔ ایک طرف اس خاتون کا جذبہ انھیں متاثر کررہا تھا اور دوسری طرف مدر تھریسا کی بلند و بالا شخصیت ان کے سامنے تھی۔ اس LIVING SAINT کو فوری طور پر مدد کی ضرورت ہے۔ چند گھنٹوں کی ذرا سی غفلت بھی اس بھڑکتے ہوئے چراغ کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرسکتی ہے۔

"لیکن" ڈاکٹر لمبارڈی نے اپنی حیثیت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی اس خواہش پر مثبت یا منفی جواب دینے سے قبل میں چاہوں گا کہ ان کی نگہداشت و علاج کرنے والے ڈاکٹروں سے گفتگو کروں۔"

"آپ کی بات میں بڑی مناسبت دلیل کا وزن ہے ڈاکٹر۔" اس نسوانی آواز نے کہا۔ "میرے فون میں کانفرنس لائن بھی ہے۔ اس لیے میں مدر تھریسا کی نگہداشت و علاج کرنے والے ڈاکٹروں سے رابطہ قائم کروں گی اور انھیں آپ کی لائن سے جوڑوں گی۔ کیا آپ مجھے تھوڑی سی مہلت دیں گے۔"

"ضرور" ڈاکٹر لمبارڈی نے جواب دیا۔

ڈاکٹر جارج لمبارڈی نے ہفتہ کی اس شام باہر جانے کے تمام پروگرام منسوخ کردیے کیونکہ انھیں ہندوستانی ڈاکٹروں کی ٹیم سے گفتگو کرنی تھی۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ فون پر رابطہ کب قائم ہوگا۔ انھیں یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس بات چیت کا سلسلہ کتنی دیر تک چلتا رہے گا۔

فون کا انتظار کرتے ہوئے ڈاکٹر لمبارڈی اپنے ماضی کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگئے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کے دل میں اس بات کی بڑی خواہش

تھی کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ قابلیت کو محض اپنے آپ کو اپنے خاندان کے افراد کو خوشحال زندگی دینے کے لیے ہی نہ استعمال کریں بلکہ اس عامیانہ روش سے ہٹ کر کسی اچھے مقصد یا عمدہ اصول کو آگے بڑھانے کے لیے بھی کام آئیں۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں جب انھوں نے میڈیکل کے ابتدائی امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیے تھے تو انھیں امریکہ کی ایک نامور یونیورسٹی کی جانب سے قابلِ تحسین اسکالرشپ کی پیش کش آئی تھی لیکن ان ہی دنوں میں نیویارک کی ایک نواحی بستی میں رہنے والے پست ماندہ معیار کی زندگی گزارنے والوں لوگوں کی بہبودی و تندرستی کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ڈاکٹر لمبارڈی نے ایک پروجکٹ پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ ان کے خیال میں یہ مہم بڑا اچھا سماجی مقصد رکھتی تھی۔ اس لیے ان کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ نیویارک کے باہر سے آئی ہوئی اسکالرشپ کی پیش کش کو انھوں نے پسِ پشت ڈال دیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۴ء میں انھیں ایسے ہی ایک بامقصد پروگرام کے تحت کینیا جانے کا موقع ملا تھا۔ مشرقی کینیا کے ایک حصے میں ان دنوں ایک بے نام سی بیماری متعدی بن کر بڑی تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔ تقریباً ۸۰ فی صد آبادی کا تناسب اس بیماری کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ ڈاکٹر لمبارڈی نے اپنے طور پر تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس ۸۰ فی صدی آبادی کو اس موذی بیماری سے نجات دلوائیں گے اور وہاں کی دنیا بدل دیں گے۔ لیکن ان کے ارادوں کے راستے میں سیاسی و سماجی پیچیدگیاں آئیں۔ وہ ان رکاوٹوں کا مقابلہ نہیں کر سکے اور پسپا ہو گئے۔ بڑے ناامید ہو کر وہ سوچنے لگے کہ یہ دنیا بدلنے والی نہیں ہے۔ یہ جوں کی توں رہے گی۔ اس لیے انھوں نے اپنی ذہنی ساخت میں تبدیلی پیدا کی۔ وہ واپس نیویارک شہر جائیں گے اور خاموشی کے ساتھ اپنے خاندان کے افراد کو معیاری زندگی مہیا کرنے کے لیے توجہ دیں گے۔

چار پانچ سال کی خاموش زندگی کے بعد اب انھیں دنیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت اور نیک دل و ہمدرد خاتون کو بچانے کا پیام آیا ہے۔ غریب و بے بس لوگوں کی امداد مدر تھریسا کی صحت کی تندرستی کے ذریعہ! ڈاکٹر لمبارڈی کے

ذہن میں دبا ہوا وہی پرانا انسانی احساس دوبارہ عود کر آیا۔

اس خاتون نے مدر تھریسا کی ٹیم کے ڈاکٹروں سے رابطہ قائم کیا اور وہ سب ایک کے بعد ایک لائن پر آتے رہے۔ فون پر ڈاکٹر لمبارڈی نے علاج کے بارے میں ان سب لوگوں سے گفتگو کی اور اپنے شکوک کے نوٹس بنائے۔ ان تمام ڈاکٹروں سے پوچھا کہ اگر وہ ان کی مدد کرنے کے لیے کلکتہ آئیں تو انھیں کسی قسم کا اعتراض تو نہیں ہوگا۔ ہندوستانی ڈاکٹروں کی ٹیم کو اس بات کا ضرور خیال آرہا تھا کہ ڈاکٹر لمبارڈی بھلا کیا کر سکتے ہیں۔ اس ٹیم میں ہندستان کے قابل ڈاکٹر ہیں۔ مدر تھریسا موت کے دہانے پر ہیں نیویارک سے کلکتہ کے درمیان کوئی بارہ ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ اس فاصلے کو عبور کرنا چٹکی بجانے کا کھیل نہیں۔ اس کے باوجود ان ڈاکٹروں نے ڈاکٹر جارج لمبارڈی کو خوش آمدید کہا۔

"میں ممکنہ عجلت کے ساتھ، ذرا بھی وقت گنوائے بغیر یہاں سے نکل رہا ہوں۔" ڈاکٹر لمبارڈی نے انھیں یقین دلایا۔

لیکن دو بڑی رکاوٹوں کا احساس انھیں بعد میں ہوا۔ ڈاکٹر لمبارڈی کے پاسپورٹ کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ نیا پاسپورٹ حاصل کرنے کا دھیان انھیں نہیں آیا تھا۔ اگر ان کے پاس پاسپورٹ ہوتا تب بھی کلکتہ جانے کے لیے ہندوستانی کنسولیٹ سے ویزا بھی لینا پڑتا ہے۔ ہفتہ ہونے کی وجہ سے امریکن پاسپورٹ آفس اور ہندوستانی کنسولیٹ کا ویزا سیکشن بند تھے۔ پیر تک ان دونوں امور کے لیے انتظار کرنا ضروری نظر آرہا تھا۔ نیا پاسپورٹ بنانے کے لیے اصولاً دو تین دن تو لگ ہی جاتے ہیں۔

ڈاکٹر لمبارڈی نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ پاسپورٹ آفس کے سربراہوں کے فون نمبر تلاش کیے اور انھیں فون کیے۔ اپنے گھروں پر جو لوگ مل گئے، ان پر وہ مدر تھریسا کے نام کا جادو جگاتے رہے۔ لوگ انکار کرتے رہے کہ وہ ہفتہ اتوار کو کام نہیں کر سکتے۔ ان کی اپنی مشکلات بھی تھیں۔ آخر کار فون پر ایک خاتون مل گئیں۔ انھوں نے ڈاکٹر لمبارڈی کو ڈھارس دی۔

"آپ مدر تھریسا کے لیے کلکتہ جا رہے ہیں۔ آپ کو پاسپورٹ فوری طور پر ملنا

چاہیے۔ بتائیے کب چاہیے؟"

"جس قدر جلد ہو سکے" ڈاکٹر لمبارڈی نے کہا۔

"کل اتوار ہے۔" اس خاتون نے کہا "صبح ٹھیک ۶ بجے پاسپورٹ کے دفتر پر آجائیے، آپ کا پاسپورٹ کاونٹر پر پک اپ کرنے کے لیے تیار رہے گا۔"

اسی طرح ہندوستانی کنسولیٹ کے سربراہ نے یقین دلایا۔ "آپ کو ویزا اتوار کے دن صبح سات بجے مل جائے گا۔"

جب پاسپورٹ لے کر ڈاکٹر لمبارڈی ہندوستانی کنسولیٹ کے دفتر ویزا لینے کے لیے گئے تو آٹھ افراد ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ان تمام کی زبان پر ایک ہی طرح کے جملے تھے۔

"ہندوستان میں مدر تھریسا خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ایک خاص شخصیت ہیں۔"

"کلکتہ کے غریبوں کے لیے مدر تھریسا بھگوان کا درجہ رکھتی ہیں۔"

"ان کے بغیر کلکتہ کے ہزاروں یتیم بچّے، بے بس عورتیں بے سہارا ہو جائیں گی۔"

ڈاکٹر لمبارڈی کسی قدر نروس ہوئے اور بولے۔

"آپ لوگ یہ نہ بھولیں کہ ان کی عمر ۸۹ سال کی ہے، ان پر قلب کا شدید حملہ ہوا ہے۔ اس وقت میں ان کی حالت کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔"

چوبیس گھنٹوں کے بعد ڈاکٹر لمبارڈی کلکتہ کے وڈلینڈ نرسنگ ہوم سے بہت قریب آتے جارہے تھے۔ وہ یہ سوچ کر نروس ہو رہے تھے کہ ہندوستان کے بہترین اور قابل ڈاکٹر مدر تھریسا کی نگہداشت کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر مغربی ماحول کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ایسی صورت میں وہ کیونکر ظاہر کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر لمبارڈی ان ڈاکٹروں پر ترجیح دیئے جانے کے قابل ہیں۔ ان تمام ڈاکٹروں سے انھوں نے فون پر گفتگو ضرور کی ہے۔ کلکتہ آنے کے لیے ان کی رضامندی ضرور حاصل کرلی ہے۔ اس کے باوجود انھیں خیال آرہا تھا کہ کیا یہ

ہندوستانی ڈاکٹر ان کی حیثیت کو قبول کریں گے ؟

جوں ہی ڈاکٹر لمبارڈی وڈلینڈ نرسنگ ہوم کی عمارت میں داخل ہوئے ڈاکٹروں کی ٹیم نے ان کا خیر مقدم کیا اور کچھ دیر کی گفتگو کے بعد دریافت کیا کہ اس ٹیم کے طریقۂ علاج میں آخر کیا کمی رہ گئی ہے جو ڈاکٹر لمبارڈی محسوس کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر لمبارڈی نے کہا کہ وہ اپنی رائے دینے سے قبل مدر تھریسا کا معائنہ کریں گے اور ان تمام رپورٹوں کا تجزیہ کریں گے جو علاج کے سلسلے میں حاصل کی گئی ہیں۔ ڈاکٹروں کی ٹیم راضی ہو گئی۔

ڈاکٹر لمبارڈی مدر تھریسا کے اس اسپیشل وارڈ کے اندر گئے جہاں قلب پر شدید حملے کے شکار مریضوں کو رکھا جاتا ہے۔ مدر تھریسا کے بارے میں ڈاکٹر لمبارڈی نے صرف اخباروں میں پڑھا تھا کہ انھوں نے قابلِ قدر نوبل پرائز ایوارڈ برائے امن لیا ہے اور یہ کہ انھوں نے اپنی تمام زندگی ہندوستان کے غریبوں کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی۔ آج پہلی بار ڈاکٹر لمبارڈی نے انھیں دیکھا۔ پلنگ کی اوپری سطح سے ہم سطح ہو کر ایک انسانی ڈھانچہ ہے جس پر جھلّیاں پڑی ہوئی، چمڑی کی چادر مونڈھ دی گئی ہے۔ چہرے پر اندر کی جانب دھنسے ہوئے دو حلقے ہیں جس کے اندر جڑی ہوئی دو آنکھیں چمک رہی ہیں۔ ڈاکٹر لمبارڈی نے سوچا کہ کیا یہی وہ چٹان ہے جس کے سائے تلے کئی ہزار مدقوق چہرے گلاب بنے، کیا یہ وہی آسمان کو چھونے والا ستون ہے جس کے اوپری کنارے پر بے شمار بے بس و مجبور لڑکیوں کا تبسم ایک بڑا سا پرچم بن کر لہرا رہا ہے۔ ان کی یہ پہچان انھیں سرور دینے لگی کہ دیکھو یہی وہ جادوگرنی ہے جس نے کرۂ ارض کے اطراف نمایاں رنگوں کی دھنک بنائی ہے۔ یہ کمزور خاتون دراصل چمن کی وہی دیدہ ور ہستی ہے جس کے نظر نہیں آنے پر نرگس اپنی بے نوری پر رویا کرتی ہے۔

ڈاکٹر لمبارڈی نے مدر تھریسا کا معائنہ کیا اور وہ تمام عام سوالات

پوچھے جو کہ ڈاکٹر معائنے کے وقت اپنے مریضوں سے دریافت کرتے ہیں۔ معائنے کے دوران مدر تھریسا نے ڈاکٹر لمبارڈی کو ایک انتباہ دیا جو کہ ان کی دانست میں ایک ضروری امر تھا۔ اس انتباہ کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ کلکتہ سے باہر جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ کلکتہ سے باہر یہاں سے صحتیاب ہونے کے بعد ہی نکلیں گی، اس سے قبل نہیں۔ اور یہ کہ ان کے علاج کے بارے میں اس آئے ہوئے امریکن ڈاکٹر اور علاج جاری رکھے ہوئے ہندوستانی ڈاکٹروں کی ٹیم کے درمیان کوئی اختلافِ رائے نہیں ہونا چاہیے۔

مدر تھریسا کو کلکتہ یا ہندوستان سے باہر لے جانے کے لیے ڈاکٹر لمبارڈی نہیں آئے تھے۔ اس لیے اس انتباہ کا پہلا حصّہ ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن دوسرے حصّے کے لیے البتہ ڈاکٹر لمبارڈی ہلکا سا تردّد محسوس کر رہے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات ان کے لیے ایک نئی رکاوٹ بن جائے۔

ڈاکٹر لمبارڈی نے یہ نکتہ بھی نوٹ کیا کہ مدر تھریسا پر جب قلب کا شدید حملہ ہوا تو کارڈیالوجسٹ اس بات کے لیے فکر مند تھے کہ کہیں ان کے قلب کی حرکت رُک نہ جائے۔ اس لیے انھوں نے پیس میکر ان کے جسم سے جوڑا تھا۔ پیس میکر دھات کے ایک تار سے ملحق تھا اور وہ تار مدر تھریسا کے بائیں بازو، جسم کے اندر چھو کر دل سے منسلک کیا گیا تھا۔ اس میں پیس میکر کو آن کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کیونکہ قلب کی حرکت بند ہوئی ہی نہیں تھی۔ صرف احتیاط کے پیشِ نظر اسے لگایا گیا تھا کہ اگر یہ کبھی رُک جائے تو اسے مصنوعی طریقے سے حرکت میں لایا جا سکے۔

ڈاکٹر لمبارڈی نے تمام حاصل کیے ہوئے کلچروں کا تجزیہ کیا، حاصل کی ہوئی تمام رپورٹوں کو بغور دیکھا۔ بخار نہیں اُترنے کے جو ممکنہ وجوہ انھوں نے اپنے مکان پر ہندوستانی ڈاکٹروں سے گفتگو کرنے کے بعد نوٹ کیے تھے وہ تمام آہستہ آہستہ زائل ہوتے گئے۔ صرف ایک شک ابھی باقی رہ گیا تھا۔

انھوں نے تمام ڈاکٹروں کی میٹنگ بلائی اور ان کے سامنے اپنے معائنے کی

رپورٹ پیش کی۔ ان کی گرتی ہوئی صحت کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے اس شک کا اظہار کیا کہ پیس میکر کا وہ پیوست تار جو اُن کے جسم کے اندر دل کی دھڑکن سے رابطہ رکھتا ہے، ان کے اندرونی جسم کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ تیز بخار کی وجہ وہی تار ہے۔ ان کے خون کے سفید خلیے جسم کے اندر امپورٹ کیے ہوئے اس تار کو نکال پھینکنے کی کوشش میں کمزور ہوتے جارہے ہیں۔ اگر وہ خلیے کمزور ہوتے ہوتے ختم ہوجائیں گے تو بیرونی اثرات سے مدافعت کرنے کی طاقت بھی ختم ہوجائے گی اور اس تیز بخار کی گرمی ان کے وجود پر پوری طرح حائل ہوکر ان کے جسم کو ہمیشہ کے لیے سرد و بے چین کردے گی۔ انھوں نے تمام ڈاکٹروں سے گزارش کی کہ وہ اس بات کے لیے ان کے ہم خیال ہوجائیں کہ مدر تھریسا کے جسم سے اس پیس میکر کو نکال دیا جائے۔ انھوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں بتایا کہ مغربی ہسپتالوں میں بھی ایسے مشاہدات اور ایسے خیالات کبھی کبھی رونما ہوجاتے ہیں لیکن قلب کی بیماریوں کے ماہر یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ مدر تھریسا کے قلب پر شدید حملہ ہوا ہے۔ وہ ابھی خطرے سے باہر نہیں نکلیں۔ اگر ان کے قلب کی حرکت اچانک رُک جائے تو تمام ڈاکٹر بے بس و لاچار ہوجائیں گے۔ اس پیس میکر کی موجودگی میں صرف اسے آن کرنے کی ضرورت ہوگی اور وہ قلب کی حرکت کو قائم رکھ سکیں گے۔ ٹیم کے دوسرے ڈاکٹروں نے محسوس کیا کہ یہ امریکین ڈاکٹر مدر تھریسا کے دیئے ہوئے انتباہ کو رد کررہا ہے۔ اس لیے انھوں نے بھی پیس میکر کو نکالنے کے خلاف اپنی رائے دی۔ طے یہ ہوا کہ اگر مدر تھریسا کا تیز بخار کم نہیں ہورہا ہے تو ANTI BIOTICS کے استعمال پر یا ایسی ہی کوئی متبادل تجویز پر گفتگو ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر لمبارڈی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ اکثریت کی رائے کے ساتھ ہولیے اور بخار کو کم کرنے کے لیے مختلف تجاویز طے ہوئیں۔

پانچ دن گزر گئے۔ مدر تھریسا کا تیز بخار کم نہیں ہوا۔ تپش سے بدن جلتا رہا۔

ان کا کمزور جسم کمزور تر ہوتا رہا۔ مدافعت کرنے والے سفید جسیمے لال خون کے اندر ماند ہوتے چلے گئے۔ یہ پانچ دن ڈاکٹر لمبارڈی کے لیے بڑی آزمائش اور بہت بے چین کرنے والے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مدر تھریسا نے اپنے ابتدائی جملوں کے ذریعے ڈاکٹر لمبارڈی کی توجہ مبذول کرکے شاید یہ واضح کرنا چاہا تھا کہ وہ اس خطۂ زمین کا حصّہ ہیں جہاں کہ وہ رہتی ہیں۔ اختلافِ رائے کے امکان پر ضرب لگا کر وہ ان لوگوں کے لیے اپنی محبّت، اعتماد، ایثار و قربانی کے جذبات کی وضاحت کرنا چاہتیں تھیں جن کے درمیان وہ سانسیں لے رہی ہیں اور اپنے کام کو انجام دے رہی ہیں۔

ڈاکٹر لمبارڈی نے محسوس کیا کہ وہ ایک پیشہ ور ڈاکٹر ہیں۔ اپنے مریضوں کے لیے ان کے اپنے بھی فرائض ہیں اور مدر تھریسا جیسی مریضہ کے لیے تو یہ فرائض کچھ زیادہ ہی اہم ہیں۔ اگر وہ ان فرائض کو پورا نہیں کریں گے تو اُن کا ضمیر انھیں زندگی بھر کچوکے دیتا رہے گا۔

پانچویں دن ڈاکٹر لمبارڈی نے اپنے اندر ہمت پیدا کی۔ اپنی آواز میں خود اعتمادی سموئی اور ڈاکٹروں کی ٹیم سے کہا کہ وہ اپنی ابتدائی رائے پر قائم ہیں کہ مدر تھریسا کے جسم میں شدید بخار اس پیس میکر کے تار کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے کہا "اگر آپ پیس میکر کو ان کے جسم سے نکالتے ہیں تو میں جانتا ہوں کہ ہر دم آپ کو یہ خوف رہے گا کہ کہیں ان کا قلب بند نہ ہو جائے اور ان کی زندگی ختم نہ ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر یہ پیس میکر نہیں نکالیں گے تو میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ زندہ نہیں رہیں گی۔ ایک طرف آپ کا اندیشہ ہے دوسری جانب میرا یقین ہے۔ اگر آپ میری رائے سے اتفاق نہیں کرنا چاہتے ہوں تو یہ آپ کا اپنا اختیار ہے۔ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میں تو یہاں سے جلد ہی چلا جاؤں گا لیکن سوچیے، ہر حالت میں نقصان آپ ہی لوگوں کا ہوگا۔ آپ کی کمیونٹی اور آپ کا ملک ایک ہمہ گیر فرشتہ صفت ہستی کو کھو دے گا۔ آپ کے ملک کے عوام جو آپ کے علاج پر اعتماد کر رہے ہیں، بڑے ناامید ہو جائیں گے۔ کیا آپ لوگ اپنے عوام کے اعتماد کو ٹھیس

پہنچانا چاہیں گے؟"

جوں ہی ڈاکٹر لمبارڈی نے اپنی گفتگو ختم کی، ڈاکٹروں کی ٹیم نے طے کیا کہ وہ پیس میکر کو مدر تھریسا کے جسم سے نکال دیں گے۔

چوبیس گھنٹوں کے اندر مدر تھریسا کا بخار اُتر گیا۔ اڑتالیس گھنٹوں کے اندر ان کے خون کے سفید خلیے دوبارہ طاقت ور ہو گئے۔

ڈاکٹر لمبارڈی مدر تھریسا کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بولے "دنیا کے سامنے آپ کا وجود ایک فرشتے کی طرح ہے۔ آپ کی زندگی نیک اور اعلیٰ مقصد رکھتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نیک اور اعلیٰ مقصد کے راستے میں رکاوٹ آئی تو مجھے ایک چھوٹا سا رول ادا کرنے کا موقع ملا۔ آپ کا بخار کم ہو گیا ہے۔ میں اب واپس جا رہا ہوں۔ آپ کی صحت کی دوسری شکایتوں کی نگہداشت کے لیے بہترین ڈاکٹروں کی ٹیم آپ کے ساتھ ہے۔"

واپسی پر جب وہ نیویارک کے جے ایف کینیڈی ایرپورٹ کے لاؤنج میں پہنچے تو اخبار کے ایک رپورٹر نے پوچھا "اپنے سفر کے تعلق سے آپ کے کیا تاثرات ہیں؟"

ڈاکٹر لمبارڈی نے اس رپورٹر کو پہچانا۔ کینیا سے جب وہ واپس لوٹے تھے تو اس رپورٹر نے ایسا ہی سوال کیا تھا۔ ڈاکٹر لمبارڈی مسکرا کر بولے۔

"میرا نقطۂ نظر اب بدل گیا ہے۔ ہم اس دنیا کو رہنے کے لیے خوبصورت تر جگہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن ایسی تبدیلی لانے کے لیے مضبوط قوتِ ارادی کے بلند قامت لوگوں کی کارکردگی کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ مدر تھریسا ایسی ہی بلند قامت شخصیت ہیں۔"

پُرانا رنگ

پولیس اسٹیشن کے فون کی گھنٹی بجی۔ پولیس سارجنٹ مارٹن نے ریسور اُٹھاکر" ہلو"
کہا اور پوچھا" میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"
جواب میں کسی نے کچھ نہیں کہا۔ زور زور سے کسی کے سانس لینے کی آواز سُنائی
دے رہی تھی جیسے کوئی بدحال ہو رہا ہو۔ سارجنٹ مارٹن نے دوبارہ کہا:
"آپ اپنے گھر کا پتہ اور نام بتادیں تاکہ ہم میں سے کوئی فوراً پہنچ کر آپ کی مدد
کرسکے۔ ہم دس پندرہ منٹ کے اندر پہنچ جائیں گے۔"
فون کے اس نمبر سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ وہی لمبی لمبی سانس کی آواز رُکنے کا نام
نہیں لے رہی تھی۔ انٹر کام کے ذریعے مارٹن نے اپنے سپروائزر کو فوراً اطلاع دی" کوئی
سخت تکلیف میں ہے سر! اتنی زیادہ تکلیف معلوم ہوتی ہے کہ شکایت درج کرنے والے
کے منہ سے الفاظ بھی نہیں نکل رہے ہیں، صرف سانس کی غیر معمولی رفتار کا
پتہ چل رہا ہے۔"
پولیس کی مشنری فوراً حرکت میں آگئی۔ ٹیلی فون کمپنی کے آفس کے ذریعے سے نہ صرف
فون نمبر ملا بلکہ فون کرنے والے کا نام اور پتہ بھی مل گیا۔

"مسٹر آدم اسمتھ - ۴۴ باتھرسٹ اسٹریٹ - عمر ۷۲ سال - اپنی بیوی باربرا عمر ۷۰ سال کے ساتھ رہتے ہیں۔ دونوں ریٹائرڈ ہیں۔"

مارٹن نے حالات کا تجزیہ کیا "کوئی خطرے کی گھڑی ہے جس کی لپیٹ میں دونوں آ گئے ہیں۔ شاید ان میں کا ایک اس حد تک بہتر صورت حال میں ہے کہ پولیس کو فون کر سکا۔ شاید جوں ہی اس نے نمبر ڈائیل کیا کوئی خطرہ ان پر غالب آ گیا۔"

مارٹن نے اپنے ہیڈ سے دوبارہ گفتگو کی اور یہ اندازہ لگایا گیا کہ دونوں میں سے ایک کی موت وقوع پذیر ہو چکی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ بے انتہا نڈھال حالت میں موت کی جانب بڑھ رہا ہو اور دوسرا کسی قدر ہوش میں ہے۔ دوسری ممکنہ صورتیں بھی گفتگو میں آئیں۔ اس لیے یہ طے ہوا کہ ایک ایمبولنس کی گاڑی کے ساتھ ایک سُراغ رساں بھی ہو۔

چند منٹوں کے بعد وہ آدم اسمتھ کے گھر کے دروازے پر تھے۔

انھوں نے بیل بجائی۔ دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔

سُراغ رساں برک نے گھر کے چکر لگائے۔ کوئی کھڑکی کھُلی ہوئی یا کسی کھڑکی کے شیشے ٹوٹے ہوئے نہیں تھے۔ مارٹن نے دروازے پر آواز لگائی "مسٹر آدم اسمتھ! میں پولیس سارجنٹ مارٹن ہوں آپ کی مدد کرنے کے لیے آیا ہوں۔ کسی طرح دروازہ کھول دیں۔"

سراغ رساں برک نے دائیں بازو کے پڑوسی کے مکان پر جا کر کال بیل بجائی۔ حمیداللہ کی بوڑھی بیگم نے دروازہ کھولا اور برک کے سوال پر کہنے لگی کہ ان لوگوں کو کوئی غیر معمولی کیفیت دکھائی نہیں دی اور نہ کوئی ایسی آواز یا شور سُنائی دیا اس لیے ان کی توجہ آدم اسمتھ کے گھر کی طرف نہیں گئی۔ انھوں نے کسی کو آتے ہوئے یا جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔

سامنے کے پڑوسی نے بھی ایسی ہی اطلاع دی اور کہا کہ انھوں نے آدم اسمتھ اور ان کی بیوی کو پچھلی شام لان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھا ہوا دیکھا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ اپنی کار کو ہمیشہ گیرج میں رکھنے کے عادی ہیں اور گیرج بند رہتا ہے۔ اس لیے یہ بتایا نہیں جا سکتا کہ آدم اسمتھ اپنے گھر کے اندر ہیں یا نہیں ہیں۔

وقت بڑھتا جا رہا تھا۔ زیادہ وقت گنوانا کسی بھی پچھتاوے کا پیش خیمہ بن

سکتا ہے۔ اس لیے سارجنٹ مارٹن نے کسی بھی ترکیب سے دروازہ کھولنے کی اجازت حاصل کرلی۔ مارٹن نے دروازے سے پیوستہ ایک کھڑکی کے شیشے کو توڑا تاکہ اندر ہاتھ ڈال کر دروازے کی چٹخنی کو گرائے۔ اس اثناء میں مارٹن کی مدد کے لیے پولیس اسٹیشن سے ایک دوسرا سارجنٹ تھامسن بھی آگیا۔ دروازہ کھولنے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مارٹن نے تھامسن کو ہدایت دی کہ وہ دروازے پر کھڑا رہے اور کسی کو اندر آنے یا باہر جانے نہ دے۔

مارٹن اور سراغ رساں برک نے جوں ہی ارادہ کیا کہ دروازے کے اندر داخل ہوں ایک کتّا اندر کی جانب سے آیا اور بھونکنے لگا۔ برک نے اس کے اوپر نیند طاری کرنے والی گیس چھوڑی اور دروازے کی آڑ میں اس وقت تک کھڑے رہے جب تک کتّے کے بھونکنے کی آواز میں گیس کے اثر سے نرمی نہ پیدا ہوئی۔

مارٹن کے ہاتھ میں پستول تھی اور برک کے کاندھے پر سراغ رسانی کے آلات۔ دونوں اندر چلے گئے۔

ان کے اندر جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک کار گھر کے سامنے آکر رکی۔ ایک معمر آدمی اور معمر خاتون حواس باختہ ہوکر گھر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ سارجنٹ تھامسن نے انھیں دروازے پر روک دیا۔

"یہ سب یہاں کیا ہو رہا ہے؟" آتے ہوئے معمر آدمی نے بڑی فکر کے ساتھ کہا۔

"میں ٹھیک طرح سے نہیں جانتا کہ کیا ہو رہا ہے" تھامسن نے کہا "لیکن کوئی خطرے کی بات ضرور معلوم ہوتی ہے۔ آپ تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تو انکشاف ہوجائے گا۔"

"کاہے کا خطرہ؟" معمر آدمی کے ساتھ آئی ہوئی معمر خاتون نے پوچھا۔ وہ بھی پریشان نظر آرہی تھی۔

"شاید کسی کا خون ہوگیا۔"

"خون؟ — اوہ گاڈ" دونوں اپنی آوازوں میں بڑی حیرت کے ساتھ بولے۔ معمر آدمی نے دوبارہ کہا۔ "یہ میرا گھر ہے۔ میں آدم اسمتھ ہوں۔ اس گھر میں ہم دونوں کے

سوائے تیسرا آدمی نہیں رہتا۔ ہاں ہمارا ایک کتا بھی ہے۔ لیکن وہ اتنا شریف ہے کہ نہ وہ کسی کی جان لے سکتا ہے اور نہ اسے کوئی مارنا پسند کرے گا۔"

"ہائے مسٹر اسمتھ" تھامسن نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ سارجنٹ مارٹن اور سراغ رساں برک حالات کا پتہ چلانے کے لیے اندر گئے ہیں۔ انھوں نے مجھے ہدایت دے رکھی ہے کہ میں کسی شخص کو بھی اندر سے باہر یا باہر سے اندر نہیں گزرنے دوں۔ ان کا مطلب آپ سے قطعی نہیں ہو گا۔ اس لیے میں بیل بجا کر انھیں بلاتا ہوں۔"

تھامسن نے باہر کے دروازے پر لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

مسٹر اسمتھ کہہ رہے تھے۔

"گڈ مارننگ شاپنگ پلازا جو یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہے وہاں پر ہم لوگ کچھ گروسری خریدنے کے لیے گئے تھے۔ توقع تھی کہ ہم آدھے گھنٹے کے اندر واپس ہو جائیں گے۔ لیکن جب ہم گروسری لے کر اپنی کار کے پاس آئے تو پتہ چلا کہ کار خراب ہو گئی ہے۔ ہم نے کاروں کی ایسوسی ایشن کے دفتر کو فون کیا تاکہ وہ اپنا میکانک روانہ کر سکیں۔ اس کے آنے اور کار کے درست ہونے میں گھنٹہ سوا گھنٹہ لگ گیا۔"

"ہو سکتا ہے کسی نے آپ کی کار کو آپ کی غیر موجودگی میں عمداً خراب کر دیا ہو تاکہ آپ کو گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے" تھامسن نے کہا۔

"نہیں" اسمتھ کی بیوی بولی "یہ ہیڈ لائٹ بند کرنا بھول گئے تھے اور کار کی بیٹری جو پرانی ہے ختم ہو گئی۔ اسے ری چارج کروانا پڑا اور دو اسکرو جو ڈھیلے ہو گئے تھے انھیں ٹائیٹ کروانا تھا بس اتنی ہی بات ہوئی۔"

اندر سے برک اور مارٹن آئے۔ مسٹر اسمتھ اور ان کی بیوی کے ساتھ وہ دوبارہ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ فون کا ریسور ابھی تک اپنے کریڈل سے نیچے گرا ہوا تھا۔ مسٹر اسمتھ نے بتایا کہ انھوں نے اپنے فون کو کمپیوٹر اور آواز بڑا کرنے والے آلے سے منسلک کر رکھا ہے۔ ایک پروگرام کے ذریعے فون کے بہت سے ضروری نمبروں کو انگریزی کے حروفِ تہجی کے ایک ایک حرف پر مبذول کر دیا گیا ہے۔ برک کے پوچھنے پر

اسمتھ نے بتایا کہ پولیس کو فون کرنے کے لیے کمپیوٹر کے بورڈ پر سے انگریزی حرف تہجی " P " کا دبایا جانا کافی ہے۔ پولیس سے رابطہ قائم ہو جائے گا۔

آدھے گھنٹے کے بعد اپنی تفتیش کی رپورٹ مکمل کر کے برک نے ہیڈ آفس کو فون کیا۔

" بات بڑی معمولی ہے سر! آدم اسمتھ اور ان کی بیوی کو آج صبح گروسری خریدنی تھی۔ ان کا اندازہ تھا کہ گھر سے باہر جانے، واپس آنے اور خریداری میں کوئی آدھا گھنٹہ لگے گا، زیادہ نہیں اس لیے جب انھوں نے اپنے کتے کو سوتا ہوا پایا تو اسے یوں ہی سوتا ہوا چھوڑ کر وہ باہر چلے گئے۔ اس اثنا میں کتا جاگ اٹھا۔ اس نے اسمتھ کو تلاش کیا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا تو اسے اپنی تنہائی اور قید کا احساس ہوا۔ کھڑکی میں سے جھانک کر باہر لان میں دیکھنے کے لیے وہ میز پر کودا تو فون کا چونگا اپنے کریڈل سے نیچے گر پڑا۔ اس اچھل کود میں کتے کا پاؤں کمپیوٹر کے بورڈ کے حرف "پی" (P) پر پڑا جس کی وجہ سے فون پولیس اسٹیشن سے مل گیا۔ جب مارٹن نے فون پر " ہلو " کہا اور اس کے بعد گفتگو کی تو کتے کو یوں لگا جیسے یہ مسٹر اسمتھ کی آواز ہے جس کے ذریعے وہ کوئی ہدایت دے رہے ہیں۔ کتا دم ہلا کر لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، آپ واقف ہیں۔"

پھر برک ہنسنے لگا۔

ہیڈ آفس سے آواز آئی:" اس کا مطلب یہ ہوا کہ کتے نے مسٹر اسمتھ کے خلاف شکایت درج کروائی ہے وہ بے زبان ہوا تو کیا، زندگی کا شعور تو رکھتا ہے۔ جہاں زندگی کا شعور ہے وہاں قید، تنہائی اور مقاصد کی خاطر ایسا رویہ جو ایام جاہلیت میں غلاموں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا ناقابلِ قبول ہے۔

اچانک برک کے چہرے پر عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس کے ہاتھ بھنچ گئے۔ اس کے ابرووں میں خم اور آنکھوں میں چمک آئی اور وہ بولا:" اس کتے

کا رنگ کالا ہے سر!"

"رنگ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اس بے زبان نے بہت سے زبان والوں کے ساتھ دوڑ لگا رکھی ہے۔ انعام بھی لیا۔ اس کتے کا نام اب سب جاننے لگے ہیں سر۔ غلامی کے خلاف شکایت کرنے والے اس کتے کا نام ٹوٹو ہے سر! ٹوٹو سر! سر!...."

لیکن ٹیلی فون کے اس کنارے پر سر تھے ہی کہاں —— !!!

گلاب جامن، جلا ہوا

صالحہ غسل خانے میں سے کسی قدر عجلت کے ساتھ نکلی۔ بال سُکھاتے ہوئے اُس نے دیوار پر ٹنگی گھڑی کو دیکھا۔ وقت دیکھ کر اس نے یہ اندازہ لگالیا کہ اس کے شوہر کے دفتر میں چائے کا وقفہ شروع ہو چکا ہوگا۔ اس لیے اب وہ فون کرے گی تو فیروز کے کام میں مداخلت نہیں ہوگی۔ وقفے کے پندرہ منٹ کے دوران کبھی ذاتی اختیار کا کوئی کام کرلیں تو حرج ہی کیا ہے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ فون فیروز نے ہی اُٹھایا۔ صالحہ کے لہجے اور چہرے پر شوخی دوڑ گئی اور وہ چہک کر بولی۔

"جلد سے جلد میری ایک پہیلی کا جواب دیجیے۔ سوچنے کی مہلت صرف ایک منٹ ہے۔"

"کوشش کریں گے۔ بتائیے کہ پہیلی کیا ہے؟"

"سُنیے!" وہ دوبارہ بولی۔ "ہندوستان کے گلوکار محمد رفیع اور کشور کمار کی آوازوں کا آمیزہ بنائیے۔"

"جی ہاں۔ بنالیا۔"

"اس آمیزے کو پُرانی فلموں کے اداکار شمی کپور کی اچھل کود سے ضرب دیجیے۔"

"چلیے ضرب بھی دے دیا۔"

"اب جو مرکب ہاتھ میں آیا اسے امریکن زندگی کی چاشنی میں ڈبو کر نکالیے۔"

"چاشنی کے اندر میں نے مرکب کو ڈبو کر نکالا۔"

"اب مجھے بتائیے اس عمل سے آپ کو حاصل کیا ہوگا؟"

"جی وہ جو حاصل ہوگا —— حاصل ہوگا۔"

صالحہ کی دی ہوئی پہیلی فیروز کے ذہن میں اپنی تہیں کھول رہی تھی۔

"لاجواب ہو گئے نا؟" صالحہ ٹھنکی۔

"نہیں۔" فیروز چائے کی چسکی لے کر بولا "آپ کی دی ہوئی مہلت ہی کہاں ختم ہوئی ابھی۔ میں دراصل اس آمیزے، مرکب اور چاشنی سے بنائے ہوئے گلاب جامن کا مزہ لے رہا ہوں۔ دھیمی دھیمی آنچ پر آپ بڑے لذیذ گلاب جامن بناتی ہیں۔"

"ہم ایک منٹ سے زیادہ آپ کو نہیں دے سکتے۔ بتائیے کہ کیا حاصل ہوگا۔"

فیروز کی نئی دلہن نے دوبارہ پوچھا تو فیروز نے جواب دیا۔

"وہ ایک امریکن گلوکار ہے۔ میرا پسندیدہ۔ جتنا گلاب جامن پسند ہے اتنا ہی وہ بھی پسند ہے۔"

"نام بتائیے۔ نام کے بغیر آپ کا جواب قابلِ قبول نہ ہوگا۔"

"مائیکل جیکسن۔" فیروز نے ایک سانس میں کہا۔

"ارے واہ! آپ تو جیت گئے فیروز۔" صالحہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ فیروز نے ہنس کر جواب دیا۔

"آپ کو جیت لینے کے بعد ہماری ہر بازی پر اب جیت ہی کا لیبل لگا ہوا ہے۔ آپ نے بتایا نہیں کہ اس پہیلی کو بوجھ لینے کا انعام کیا ہے؟"

"مائیکل جیکسن کے پروگرام کے دو ٹکٹ۔ دوسری صف کے عین درمیان والی نشستیں۔"

"امریکہ جانا پڑے گا کیا؟"

"نہیں۔ اپنے شہر ٹورنٹو ہی میں۔" صالحہ نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ مائیکل جیکسن آپ کا پسندیدہ فنکار ہے۔ اس لیے کل جب کہ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے، ہم لوگ شام کو مائیکل جیکسن کے پروگرام میں جائیں گے۔"

"حیرت کی بات ہے۔" فیروز نے صالحہ سے کہا۔ "مائیکل جیکسن کا پروگرام کل شہر میں ہو رہا ہے اور ہم کو خبر ہی نہیں۔ آپ نے بھی ابھی بتایا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"مجھے بھی ایک گھنٹہ قبل پتہ چلا۔ اور میں نے تین بجے شام کے لیے دو سو ڈالر کے دو ٹکٹ بک کر لیے ہیں۔ آپ کو اطلاع دینی ضروری تھی تاکہ آپ کوئی دوسرا پروگرام نہ ترتیب دیں۔ اور کل دفتر سے جلد لوٹ کر آنے کی ضرورت پڑے گی۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہوئی کہ آپ نے فون کر کے مجھے بتا دیا۔ میں آج ہی اپنے سپروائزر سے گفتگو کر کے کل آدھے دن کے بعد گھر آجاؤں گا۔ لیکن یہ شو کہاں ہو رہا ہے؟"

"بات یوں ہے کہ مائیکل جیکسن نے اچانک اپنے اوقات اور خدمات کا عطیہ صرف ایک شو کے لیے ٹورنٹو جنرل ہسپتال کو پیش کیا تاکہ ہسپتال کی کمیٹی اپنی ایک تحقیقاتی مہم کے لیے رقم اکٹھی کر سکے۔ ہسپتال کا اپنا آڈیٹوریم ہے جس میں سات سو نشستیں ہیں۔ یہ ساری نشستیں فون کے ذریعے فروخت کی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سات سو ٹکٹ کی فون پر فروختگی کے لیے مائیکل جیکسن کا نام لینا ہی کافی ہے۔ مزید اشتہار بازی کی اب انھیں ضرورت ہی نہیں ہے۔ امریکن ایکسپریس کارڈ پر میں نے ٹکٹ بک کروا لیے ہیں۔ دفتر سے واپسی پر آپ انھیں اٹھا لیجیے گا۔"

ٹورنٹو جنرل ہسپتال کے لیے رقم سات سو سیٹ اور مائیکل جیکسن واقعی پبلسٹی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ٹکٹ میں بک آپ کر لوں گا۔

دوسرے دن صالحہ اپنے گھر کی رسوئی میں کھانا پکا رہی تھی۔ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جوں ہی پکوان اگلے چند منٹوں میں ختم ہو گا۔ وہ کپڑے پہن کر

تیار ہو جائے گی۔ ڈیڑھ بجے فیروز دفتر سے آئیں گے۔ دونوں ساتھ کھانا کھا کر شو کے لیے نکل جائیں گے۔ پونے تین بجے وہ ٹورنٹو جنرل ہسپتال کے آڈیٹوریم میں رہیں گے۔ وقت کا حساب ہوا۔ ایک ایک لمحہ گن لیا گیا۔

اچانک رسوئی گھر کی دیوار پر صالحہ نے دیکھا کہ ایک بڑا کاکروچ رینگ رہا ہے۔ بڑی بڑی نمایاں ٹانگیں، مونچھ کے دو موٹے بال یوں حرکت میں آ رہے تھے جیسے اس کے ہاتھوں میں تلواریں ہوں۔ پیٹھ پر گہرے لال رنگ کے پنکھ ذرا سے کھلے تھے اور آہستہ آہستہ پھڑک رہے تھے۔ صالحہ نے بڑی کراہیت محسوس کی۔

اپنے ہاتھ میں صالحہ نے رسوئی گھر کے استعمال کے خصوصی دستانے پہن رکھے تھے۔ دستانے پہنے ہوئے ہاتھ سے اس نے جھینگر کو پکڑا، تیزی سے جا کر ٹوائیلیٹ کی سیٹ کے اندر پانی میں ڈال دیا۔ زور سے اس کھٹکے کو حرکت دی جس کی وجہ سے ٹوائیلیٹ سے پیوستہ ٹینک میں سے پانی بڑے زور کے ساتھ آتا ہے اور ٹوائیلیٹ کی اندرونی سطحوں سے ہوتا ہوا ٹوائیلیٹ کے اندر پڑی ہوئی ہر چیز کو بہا کر لے جاتا ہے۔ جھینگر ٹوائیلیٹ کی دیوار سے چمٹا ہوا تھا۔ پانی اس کے آس پاس سے اور اوپر سے گذر گیا۔ جھینگر جہاں تھا، وہیں رہا۔ پانی کے گذرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ اوپر کی جانب آنے لگا۔ صالحہ کو یاد آیا کہ رسوئی میں جھینگروں کو بے دم کر کے ختم کرنے کے لیے دوا کا ڈبہ ہے جس کے اوپری بٹن کو دبانے سے دوا ایک ملحقہ چھوٹی نالی کے ذریعے گیس بن کر نکلتی ہے۔ صالحہ نے اس ٹین کے گول ڈبے کو رسوئی میں استعمال نہیں کیا تھا۔ ڈبے کے اوپر وارننگ تھی کہ اسے آگ کے آس پاس استعمال نہ کریں۔ اچانک دھماکہ ہو سکتا ہے۔ اچانک آگ بھڑک سکتی ہے۔

صالحہ دوڑ کر رسوئی میں گئی اور ٹین کے اس ڈبے کو لے آئی۔ اوپر ٹین کو دبا کر ٹائیلیٹ کی سیٹ کے اندر خوب گیس انڈیلا تاکہ جھینگر کے زندہ رہ جانے کا کوئی امکان ہی نہ باقی رہے۔ گیس کو اڑنے سے بچانے کے لیے ٹائیلیٹ کے اوپر کے ڈھکن کو گرا دیا۔

صالحہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی۔ اس اثنا میں دفتر سے فیروز بھی آگیا۔ اس نے صالحہ کو اطلاع دی کہ وہ بھی ہاتھ منہ دھو کر دس پندرہ منٹ کے اندر تیار ہو جائے گا۔ تب دونوں دوپہر کا کھانا ساتھ کھائیں گے اور ٹورنٹو جنرل ہسپتال کے آڈیٹوریم میں شو دیکھنے کے لیے نکل جائیں گے۔

ہاتھ منہ دھونے سے قبل ڈھکن اُٹھا کر وہ ٹائیلیٹ کی سیٹ پر بیٹھا اور سگریٹ سلگایا۔ دیا سلائی کو بجھا کر ٹائیلیٹ کے اندر ڈالا تاکہ جب پانی کا فوّارہ ٹینک میں سے آئے تو وہ دیا سلائی بھی بہہ کر چلی جائے۔ اس نے کئی بار یوں کیا تھا۔ بجھائی ہوئی دیا سلائی میں ایک چھوٹی سی چنگاری باقی رہ گئی تھی جو جھینگروں کو مارنے والی گیس سے مل کر دھماکہ بن گئی۔ ایک بڑے زور کا شعلہ بھی اُٹھا اور آناً فاناً فیروز کے جسم کی وہ چمڑی جو ٹائیلیٹ کے سوراخ کو ڈھانک رہی تھی، آگ کی زد میں آگئی۔ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ فیروز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ اس نے زور سے چیخ ماری۔ آگ کی جلن کی وجہ سے اس کی حالت بُری ہونے لگی۔

فون کرنے پر فوراً ایمبولنس آگئی۔ ایمبولنس کے خدمت گار لوگ اسٹریچر کو اُٹھائے جب اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو انھوں نے اطلاع دی کہ بلڈنگ کا لفٹ رک گیا ہے۔ اس لیے اسٹریچر پر فیروز کو لٹا کر سیڑھیوں سے ہو کر ہی لے جائیں گے۔ لفٹ کے دوبارہ جاری ہونے کے وقت کا انتظار کرنے میں بہت زیادہ دیر ہونے کا اندیشہ تھا۔ فیروز کو فوری طبّی امداد کی ضرورت تھی۔ سیڑھیوں پر سے اسٹریچر اُتارتے وقت ایمبولنس کے خدمت گار فیروز سے دلجوئی کی باتیں کر رہے تھے۔ اسے صبر کی تلقین دے رہے تھے۔ یوں آنے جانے والی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے آگ لگ جانے کی وجہ پوچھی۔ فیروز نے کراہ کراہ کر مختصر سی روداد سُنائی تو اسٹریچر اُٹھانے والوں پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ ہنسی اتنی زوردار تھی کہ ان لوگوں کے ہاتھ سے اسٹریچر چھوٹ گیا۔ فیروز سیڑھیوں پر گرا اور بے قابو ہو کر نیچے کی طرف لڑھکا۔ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ کولہے کی ہڈّی

میں بال آگیا۔ جلے ہوئے جسم کے حصّے میں سے چمڑی اُدھڑ گئی۔ وہ درد کو برداشت نہیں کر سکا اور بے ہوش ہونے لگا۔

کافی دیر بعد جب اسے ذرا سا ہوش آیا تو پتہ چلا کہ وہ ٹورنٹو جنرل ہسپتال کے خصوصی وارڈ میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔ اس کے متاثر شدہ جسم کے حصوں پر پلاسٹر چڑھایا گیا تھا۔ صالحہ سرہانے بیٹھی تھی۔ نرس نبض دیکھ رہی تھی۔ فیروز کو ہدایت دی جا رہی تھی کہ وہ اپنے جسم کو ذرا بھی حرکت میں نہیں لائے۔

نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنے مُنہ کے اندر ہی اندر الفاظ کو چبا چبا کر کسی قدر مبہم لہجے میں فیروز نے صالحہ سے کہا۔

"میں گلاب جامن کھا رہا تھا۔ میرا گلاب جامن شکر کی چاشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا۔ دھیمی دھیمی آگ میں بنایا ہوا وہ لذیذ گلاب جامن۔"

"دھیمی آگ میں نہیں فیروز۔" صالحہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آگ بہت تیز تھی۔ اتنی تیز کہ گلاب جامن جل کر کوئلہ بن گیا اور شکر کی چاشنی میں تیرتا ہوا ایک بند بوتل کا دیو تھا۔ میں نے بوتل کھولنے کی غلطی کی تو وہ دیو باہر نکل کر خوب پھیلا۔ اب قوی ہیکل بن کر ہماری خوشیوں کو نگل رہا ہے۔"

فیروز کے کندھے پر اپنی پیشانی رگڑتی ہوئی وہ زار و قطار رونے لگی۔

ہسپتال کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ شو ختم ہو گیا تھا۔ لوگ واپس ہو رہے تھے۔ جن لوگوں کو ٹکٹ نہیں ملے تھے وہ مائیکل جیکسن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب و بے قرار کھڑے تھے۔

کوّے

بڑی خوشگوار مسکراہٹ سے اس نے میرا خیر مقدم کیا اور انگلی کے اشارے سے بولا۔
"یہ یہاں کا اونچا مینار ہے۔"
"مینار کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اونچا ہے۔" میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے کہا۔
"لیکن اس مینار کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام میناروں میں سب سے بلند مینار ہے۔ اس سے زیادہ اونچا مینار اس علاقے میں کہیں نہیں ملے گا۔ علاقہ چھوڑیئے اس ملک میں بھی نہیں ملے گا۔"
"اچھا۔۔!" میں نے حیرت سے اپنے سر کو ٹیڑھا کیا تاکہ مینار کو اپنی نظروں کے احاطے میں لے سکوں اور اس کی بات کو پرکھ سکوں۔ کچھ دیر رُکنے کے بعد میں نے دوبارہ سوال کیا۔
"کیا واقعی اس سے زیادہ اونچا مینار اس ملک میں کہیں نہیں ہے؟"
"ہاں صاحب کہیں نہیں ہے۔" اس نے پورے یقین کے ساتھ جواب دیا۔
"یہ نہ صرف سب سے زیادہ اونچا مینار ہے بلکہ یہاں کا سب سے پہلا مینار بھی ہے۔"

اچانک اس کی نگاہیں مینار کی ایک نچلی منزل پر منڈلاتے ہوئے کوؤں پر پڑیں۔ اُسے بڑا غصہ آیا۔ اس نے اپنی پیٹھ پر لٹکتی ہوئی بندوق اُٹھائی اور کوؤں کو نشانہ بناتے ہوئے بولا۔

"میں ان سارے کوؤں کو ایک ایک کر کے گرا دوں گا۔"

بندوق کو دیکھ کر کائیں کائیں کرتے ہوئے کوّے منتشر ہو گئے — میں نے بے اعتنائی سے کہا۔

"مینار کی منزلوں پر کوّے آتے ہی ہیں۔ یہ ان کا کام ہے۔ اپنا کام نہیں کریں گے تو وہ کیا کریں گے۔"

"میں انھیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔" اس کا غصہ ابھی قائم تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کوّے، مینار بننا چاہتے تھے۔ ہر کوّا اس مینار سے اونچا مینار بننا چاہتا تھا لیکن نہیں بن سکا۔ سب کے سب کوّے بن گئے۔ اب وہ یہاں کائیں کائیں کرنے ہی نہیں گندگی پھیلانے بھی آتے ہیں۔ اس مینار کی اوپری منزل پر اُڑ کر وہاں گندگی پھیلانے کی ان کی ضد ہے لیکن میری موجودگی میں یہ ایسا نہیں کر پائیں گے۔ میں انھیں نیچے گرا دوں گا۔"

"آپ کو اس اونچے مینار سے کیا اتنا لگاؤ ہے کہ آپ اس کی حفاظت کرنے کے لیے اتنے مستعد نظر آتے ہیں اور اپنی بندوق کا بھی استعمال کرتے ہیں۔"

"ہاں جی ہے۔ بڑا لگاؤ ہے، بہت پیار ہے۔ میں صبح و شام اس مینار کو بابائے مینار کہہ کر مخاطب کرتا ہوں۔ چاہے اس کے کان ہوں یا نہ ہوں۔ بابائے مینار یعنی سارے میناروں کا بابا۔ میں چاہوں گا کہ آپ اپنے سفر کے دوران اس مینار کی تشہیر کریں۔ اس کی اونچائی کی بات لوگوں کو بتائیں تاکہ لوگوں کے علم میں آسکے کہ یہاں ایک ایسا مینار بھی ہے۔"

"آپ کو اس سے کیا ملے گا؟" میں نے اس کے فائدے کی بات پوچھی۔

"یہاں پر لوگ اس مینار کو دیکھنے آئیں گے۔ اس شہر میں رونق ہوگی۔ اس جگہ

کی شہرت ہو گی تو مجھے بڑی خوشی حاصل ہو گی۔ میں ان مہمانوں کی تصویریں اُتار کر اپنے البم کو سجاؤں گا۔ میں ان کی ضیافت کروں گا۔" وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا جیسے یہ سب کچھ ہونا اس کے لیے بڑی تسکین کی بات ہو۔ دوسرے لمحے اس نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور بولا۔

"آیئے میں آپ کی دعوت کروں گا۔ میرا ظرف کتنا بڑا ہے۔ دیکھیے اور یقین کیجیے"۔ وہ مجھے ایک درخت کے نیچے لے گیا۔ وہ بڑا گھنا اور سایہ دار درخت تھا۔ ہوائیں سرسرا رہی تھیں تو پتّوں سے جلترنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے درخت پر پتّے نہیں ہیں بلکہ گیت گانے والے ہونٹ ہیں۔ ساز بجانے والے ہاتھ ہیں۔ رقص کرنے والے پیر ہیں اور دھڑکنے والے دل ہیں۔ درخت کے نیچے ایک خوبصورت میز پر ایک بڑا سا برتن رکھا ہوا تھا۔ وہ برتن اتنا بڑا تھا کہ انواع و اقسام کے کھانے، پھل، مٹھائیاں، مشروبات وغیرہ اسی ایک برتن میں سمائے ہوئے تھے۔ اس نے میری بہت تواضع کی۔ خوب کھلایا، پلایا۔ میری دعوت کے دوران وہ مجھے لطیفے بھی سُناتا رہا اور بڑی میٹھی میٹھی باتیں کیں۔ جب میں خوب سیر ہو گیا تو اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"میرے ظرف کے بڑے ہونے کا کیا آپ کو اندازہ ہو گیا؟"

میں نے سر ہلا کر مثبت لہجے میں جواب دیا "ہاں ہو گیا" اور خوشی خوشی اپنے سفر پر چل دیا۔

جب میں اپنے سفر سے واپس لوٹا تو میرا جی چاہا کہ مینار کو دیکھوں اور مینار کی دیکھ بھال کرنے والے اس آدمی سے ملاقات کر کے اسے بتاؤں کہ میں نے بابائے مینار کی خوب خوب تشہیر کی ہے۔ میں مینار کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ مینار اپنی جگہ پر اسی طرح سے قائم تھا جیسے میرے سفر پر جانے سے قبل تھا۔ مینار کی ایک نچلی منزل کی طرف کوّے اسی طرح منڈلا رہے تھے لیکن وہ آدمی کہیں نظر نہیں آیا جس کی بیٹھ پر بندوق بھی جس سے وہ کوؤں کو نشانہ بنایا کرتا تھا اور کوّے اُڑ جاتے تھے۔ شاید وہ وہاں بہت دیر سے موجود نہیں تھا کیونکہ میں نے کوؤں کے منڈلانے میں بے خوفی دیکھی اور گندگی بھی دیکھی جو پہلے نہیں تھی۔

دفعتاً مجھے اس کا ظرف یاد آیا۔ وہی بڑا سا ظرف جس میں رکھے ہوئے انواع و اقسام کے کھانوں اور مشروبات وغیرہ سے اس نے میری ضیافت کی تھی اور جس پر خود اسے بھی بہت فخر تھا۔ میں اس طرف چلا گیا جہاں وہ بڑا سا درخت تھا۔ وہ درخت وہیں تھا۔ ویسا ہی سایہ دار اور پہلے ہی کی طرح گھنا بھی۔ اس کے پتے ہوا سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ وہ ظرف بھی وہیں تھا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ وہ ظرف سکڑ کر اتنا چھوٹا اور دب کر اتنا اتھلا ہو گیا تھا کہ اب اس میں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ میں حیرت و افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دوبارہ اس مینار کے قریب چلا گیا اور آواز دی۔

"تم کہاں ہو میرے دوست، میں تم سے ملنے اور تمھاری باتیں سننے کے لیے اپنے سفر کے اختتام پر دوبارہ یہاں آیا ہوں۔"

وہ دکھائی تو نہیں دیا لیکن میری آواز کے جواب میں اس کی آواز آئی۔

"میں وہیں ہوں جہاں پر تم نے مجھے چھوڑا تھا۔"

"میں نے تمھیں زمین پر چھوڑا تھا۔ اس مینار کے سائے میں۔ زمین ہے سایہ بھی ہے۔ لیکن ہمسایہ نہیں دکھائی دے رہا ہے۔"

میری بات پر وہ یوں کھسیا کر ہنسا جیسے میری بات اسے پسند نہیں آئی ہو۔ وہ پھر بولا۔

"جس چیز کے سائے سے بھی نفرت ہو جائے اس کا ہمسایہ بننا کیا معنی؟"

"کیا تم نے اس مینار کی تشہیر کرنے کے لیے مجھ سے نہیں کہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مینار نہیں ہے۔ زمین پر ایک بوجھ ہے۔ زمین کے جسم پر فاسد خون کا بنا ہوا ایک ناسور ہے۔"

"کیا اس مینار کو تم نے بابائے مینار نہیں کہا تھا۔ یہاں کا سب سے پہلا اور سب سے اونچا مینار نہیں کہا تھا؟"

"میں غلطی پر تھا۔ میں ایک فریب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اب اس فریب کو ڈھا کر ایک اونچا مینار بنانے کی یہاں ضرورت ہے۔"

میں نے آواز کی سمت کا پتہ چلا لیا تھا اس لیے اس کے نظر نہ آنے کے معمّہ کا حل ڈھونڈھنے کے لیے میں مینار کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ جوں ہی میں نے چند سیڑھیاں طے کیں کہ کسی محراب سے ایک کوّا پھڑ پھڑا کر نکلا اور ان کوؤں کی طرف اُڑ گیا جو مینار کی نچلی منزل کے اطراف پہلے ہی سے منڈلا رہے تھے۔ محراب سے اُڑنے والے کوّے کی پھڑ پھڑاہٹ سے اخبار کا ایک ورق اُڑ کر میرے سامنے آگرا جس پر یہ خبر جلی حرفوں میں چھپی ہوئی تھی کہ اس شہر میں بڑی عجیب قسم کی بجلی اس آدمی پر گری جو مینار کی رکھوالی کر رہا تھا اور پھر یہ ہوا کہ وہ آدمی کوّا بن کر اُڑ گیا اور اس کا ظرف چھوٹا ہو گیا۔

ادھوری سیڑھیوں سے باہر آکر میں نے مینار کی طرف دیکھا۔ کوّے اب بھی مینار کے اطراف کائیں کائیں کر رہے تھے۔ ان میں ایک کوّے کا اضافہ ہو گیا تھا۔

ادھورے لوگ

فون پر بات کا موضوع جنسی آزادی کا وہ انقلاب تھا جو پچھلے بیس سالوں میں یورپ اور یورپ کی تہذیب کو اپنائے ہوئے ممالک میں اپنے پر اتنے زیادہ پھیلا چکا ہے کہ اب وہ روشنی ماند ہوتی چلی جا رہی ہے جس کے ذریعے انسان اور حیوان کا فرق واضح رہتا ہے۔ فرانک کو جوش آنے لگا اور اس نے بے اختیارانہ طور پر دوسرے ہاتھ کو میز پر مارا اور پرجوش بیان سے پوپ کے بیان کی تائید کی جو انھوں نے عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی کے خلاف دیا تھا۔ عورتوں کو اپنے گھروں میں اپنے شوہروں اور بچّوں کی نگہداشت کرنے کے لیے رہنا چاہیے انھیں اپنے پیدا ہونے والے بچّوں کا قاتل نہیں بننا چاہیے۔

"پوپ نے جو کچھ کہا ہے سو فی صد ٹھیک کہا ہے۔ ہماری سماجی کمزوریوں کا تجزیہ جس قدر مناسب طور پر وہ کر سکتے ہیں دوسرا نہیں کر سکتا اور ان کے الفاظ میں جو جادو ہے وہ دوسروں کے لفظوں میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حق بات کہنے کے لیے انھیں کوئی پس و پیش نہیں کرنی چاہیے۔"

فرانک کی آواز گرج دار ہو گئی لیکن اس کے جواب میں جرس نے فرانک کو اس کی ڈھلتی ہوئی عمر کا طعنہ دیا۔ اپنی ڈھلتی ہوئی عمر میں وہ اب پوپ کے بیان کی تائید کر رہا ہے۔

اس وقت وہ کہاں تھا جب ایک ٹاورن میں آئرین سے پہلی بار ملا تھا۔ دُبلی پتلی کم سِن آئرین جو کپڑے پہنے ٹاورن کے اسٹیج پر رقص کرنے آجاتی تو فرانک کو خوب صورت گلاب کی شگفتگی یاد آجاتی تھی۔ دوسرے راؤنڈ پر جب اس کے آدھے کپڑے اُتر جاتے تو پانی کی سطح پر تیرنے والے نکھرے ستھرے کنول کی طرح لگتی تھی۔ تیسرے راؤنڈ پر جب اس کے جسم پر ایک چھوٹا سا تکون کپڑا تماشائیوں کے سامنے اپنے وجود کا ڈھنڈورا پیٹتا ہوا نمودار ہوتا اور اس کے کنارے میوزک کی لہر پر تھرکتی ہوئی آئرین کے جسم پر بننے والے مختلف زاویوں کے وہ قوس بن جاتے جس پر جسم کے خطوط آکر مل جاتے ہیں۔ تب فرانک آئرین کو للی کا پھول کہتا تھا۔ ایسے ہی ایک وقت جب آئرین لالہ کا پھول بن گئی تھی فرانک نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے آئرین کے سامنے اس کے جسم کی تعریف ہی نہیں کی تھی بلکہ پچاس ڈالر کے ایک نوٹ سے اس کی ہمت افزائی کی تھی۔ شو کے ختم ہو جانے کے بعد فرانک نے آئرین کے کان میں کانا پھوسی کر کے ہالی ڈے اِن، میں ساتھ ڈنر کرنے کی ڈیٹ مانگی تھی۔ اس کے بعد بہت دنوں تک آئرین، فرانک کی گرل فرینڈ بن چکی تھی۔ جرس نے اسے فرانکا کی بھی یاد دلائی جو فرانک کو ایک اشتہار کے جواب میں ملی تھی۔ وہ اپنی نئی کار میں امریکہ کے بہت سے شہروں کا ٹور کر رہا تھا اور اسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو کار ڈرائیو کر سکتی اور بور لمحات میں جل ترنگ کی طرح سوئیٹ بن سکتی۔ فرانک نے اعلان کیا تھا کہ تمام اخراجات اس کی ذمہ داری ہوں گے۔ بارہ لڑکیوں نے اپنے نام پتے اور فون نمبر روانہ کر کے اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ ان بارہ لڑکیوں کو اچھی طرح جانچ کر ان میں سے فرانک نے فرانکا کا انتخاب کیا تھا کیونکہ فرانکا نے نہ صرف اپنے بھرپور تعاون کا اقرار کیا تھا بلکہ اس کی چھاتی، کمر اور کولھوں کے گھیر فرانک کے بنائے ہوئے اعلیٰ معیاری پیمائش سے سو فی صدی مطابقت رکھتے تھے۔ جب وہ سیدھی، بائیں، اگلی اور پچھلی جانب جھکی اور فرانک کی ہدایت کے مطابق اپنے ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر کمان ہوگئی تو اس کی رگوں اور پٹھوں میں رنگ برنگی اتنی مچھلیاں نظر آئیں کہ فرانک کا دل مچل اٹھا اور اس فش اکویریم کو اپنے ساتھ کار میں

رکھنے کے خیال سے ہی اس کا سفر حسین تر بن گیا تھا۔ جریس نے باربرا کا نام بھی لیا جس کے عنابی ہونٹ، کٹورا سی آنکھیں اور کالے کالے لمبے بال دیکھ کر فرانک کو عمر خیام کی رباعیوں کے انگریزی تراجم یاد آجایا کرتے تھے۔ عمر خیام کی رباعیوں کی روح کو ٹٹولنے کی خاطر اور بس ذرا سا ریسرچ کرنے کے لیے فرانک نے باربرا کو راڈ سے چھین لیا تھا باربرا، راڈ کی کامن لا وائف بننے کے خواب دیکھ رہی تھی لیکن فرانک کی شخصیت میں اتنی جاذبیت تھی کہ وہ حسیناؤں کے سروں کے خول میں سے پرانے ابھرتے ہوئے خوابوں کو نکال کر نئے خواب ڈھال دینے کے ہنر میں اسی طرح طاق تھا جیسے کوئی اپنے کیسٹ میں سے چلتے ہوئے ٹیپ کو نکال کر فوراً دوسرا ٹیپ ڈال سکتا ہے۔ اپنی ہر چیز راڈ کے گھر پر چھوڑ کر باربرا، فرانک کے ہاں چلی آئی۔ صرف راڈ کا وہ بچہ لے کر آگئی جو ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ راڈ کے بچّے کو اپنا بچّہ بنا لینے کا وعدہ فرانک نے کیا تھا۔ فرانک کو ایک عدد بچّہ کا باپ بنانے کا کمال کرنے کے بعد باربرا جس انداز سے گھر آئی تھی اسی انداز سے گھر کے باہر چلی گئی۔ اس مفت کے لین دین میں فرانک کو بس یہی فائدہ ہوا کہ پیدائشی ترچھی نظروں سے دیکھنے والا بیٹا اس کے گھر میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

بیس پچیس سال پرانی یہ باتیں جو کہ جریس طعنے کے طور پر یاد دلا رہا تھا، فرانک کے لیے طعنہ نہیں تھیں بلکہ حسین ماضی کے وہ خوشگوار واقعات تھے جو ذہن میں ابھرا کرتے تھے تو محض فرانک کو گدگدی کرنے کے لیے۔ وہ ان پرانی یادوں کے تازہ کیے جانے پر بڑا خوش ہو رہا تھا جیسے یہ فرانک کے کارنامے ہیں اور ان کا دُہرایا جانا ایک اعزاز ہے۔ جھلانے کے بجائے فرانک خوش ہوتا رہا۔ مزہ لے لے کر ہنستا رہا اور جریس کو موقع دیتا رہا کہ وہ جتنا کہہ سکتا ہے کہتا چلا جائے۔ جب ساری تفصیلات دہرانے کے بعد جریس کے ہاں کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تو فرانک نے فخر سے جھوم کر پہلے تو بہت سی متبرک ہستیوں کی قسمیں کھائیں تاکہ اس کے بیان میں کسی جھوٹ، یا مبالغہ آمیزش کا شبہ نہیں رہے۔ اس کے بعد فرانک نے بتایا کہ اس کی شخصیت کی کشش ابھی تک ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوئی۔ اپنی بات پر ثبوت کم وزن رکھنے کے لیے فرانک نے ویرونیکا کا حوالہ دیا۔ ویرونیکا بڑی

عمر کی ہونے کے باوجود ہرنی جیسی شخصیت رکھتی ہے۔ ویسی ہی دلکش اور پھرتیلی ہے، اس کا اپنا گھر ہے، بزنس ہے اور کئی ہزار ڈالر کا فکسڈ ڈپازٹ ہے۔ ورونیکا نے کئی بار اپنے گھر کے تہہ خانے والے خوب صورت شراب خانے میں فرانک کی دعوت کی تھی۔ شراب کی چسکیاں لیتے وقت چند گنے چنے اور چھپے ہوئے الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اگر فرانک اپنی رضامندی دے تو وہ اسے اپنا بوائے فرینڈ بنا سکتی ہے کیونکہ وہ فرانک کو پسند کرتی ہے۔ لیکن فرانک نے اس طرح کا برتاؤ رکھا جیسے وہ اناڑی ہے اور ان چھپے ہوئے اشاروں کو سمجھ نہیں رہا ہے۔ بات کو آگے بڑھنے کا موقع دینے سے پہلے وہ وہاں سے نکل جایا کرتا تھا۔ یوں کئی بار ہوا ہے اور پتہ نہیں کب تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

ورونیکا کے ذکر کے بعد فرانک ماریا کے قصے سنانا چاہتا تھا اور ماریا کے بعد ہی گلڈا کا ذکر کرنا ضروری سمجھا جسے اس کے لڑکے پیٹر نے ایک سال رکھ کر چھوڑ دیا تھا۔ فرانک کو یقین تھا کہ گلڈا کے لیے جرس کے دل میں بھی ہمدردی ہوگی اور اس طرح گلڈا اور پیٹر کے بچّے کو اپنا کر فرانک جو قربانی دے رہا ہے اس کے لیے جرس ضرور اس کا حمایتی بن جائے گا۔

لیکن جب باہر کے دروازے میں باہر سے چابی لگانے کی آواز آئی تو فرانک کو یہ انداز لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ گلڈا واپس آچکی ہے۔ وہ گلڈا کی موجودگی میں نہ تو ماریا کی باتیں کرنا مناسب سمجھ رہا تھا اور نہ گلڈا ہی کی۔ اس لیے فرانک نے حکمت کے ساتھ گفتگو کے موضوع کو دوبارہ پوپ کے بیان پر مبذول کر دیا۔

دروازے کو کھول کر گلڈا اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ بچّوں کی نگرانی کرنے کے طریقے پر اس نے کورس لے رکھا تھا اور دن بھر کی مصروفیت کے بعد وہ گھر آئی تھی۔ کتابوں کو ہاتھ میں لیے وہ میز کے قریب آئی اور کھڑکی میں سے نیچے کی طرف دیکھنے لگی۔ فرانک گلڈا کو دیکھ رہا تھا لیکن راست نہیں، کَن انکھیوں سے، اس طرح کہ گلڈا کو احساس نہ ہو کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ فرانک نے اندازہ لگایا کہ گلڈا کے چہرے کے نقوش اس دن

مختلف ہیں۔ کم گفتگو کرنا اور خاموش رہنا اس کی عادت سہی لیکن وہ اس وقت سہمی سہمی سی بھی لگ رہی تھی۔ کھڑکی کی چوکھٹ سے فاصلے پر کھڑی ہو کر کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے کا انداز یہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتے ہوئے سڑک پر کسی کی موجودگی کا پتہ چلا رہی ہے۔ کھڑکی میں سے یوں دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ باہر جانے لگی۔ فرانک بلند آواز سے پوپ کے بیان کی تائید اور عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی پر بڑی فکر ظاہر کرتے ہوئے بحث کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گلڈا جو نہ اخبار پڑھتی تھی اور نہ ٹی۔ وی پر خبریں سنتی ہے، اس کی گفتگو کو سن کر واقف ہو جائے کہ پوپ کیا چاہتے ہیں۔ ہر روز کتابیں رکھنے کے بعد گلڈا بلڈنگ کے آٹھویں منزلے کے اپنے اپارٹمنٹ سے بارھویں منزلے کے اس اپارٹمنٹ میں رے کو لانے کے لیے جاتی تھی جہاں اس کی بے بی سٹنگ ہوتی تھی۔ پونے دو سال کا رے جو گلڈا اور پیٹر کا بچہ تھا۔ جواں سال پیٹر جسے فرانک نے اپنا بیٹا بنا کر بڑا کیا تھا، گلڈا کی بعض باتوں کو پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے وہ گلڈا سے چھٹکارا حاصل کر کے اب شیلی کے ساتھ الگ اپارٹمنٹ لے کر رہنے لگا تھا۔

جس دن پیٹر نے گلڈا کو چھوڑ دیا تھا، وہ بہت روئی تھی۔ فرانک کے گھر آکر روتی تھی اور کہتی تھی کہ وہ اتنے چھوٹے بچے کو لے کر کہاں جائے اور کیا کرے۔ فرانک نے یہ کہہ کر گلڈا کو تسلی دی تھی کہ ترچھی نظروں سے دیکھنے والا پیٹر گلڈا کی خوبیوں کو نہیں دیکھ سکا۔ یہ اس کی بدقسمتی بھی ہے اور نادانی بھی۔ لیکن فرانک کی نظریں ترچھی نہیں ہیں۔ گلڈا کو اپنے گھر میں پناہ دینے کے لیے فرانک راضی ہو گیا تھا اور رے کے جسم میں چونکہ پیٹر کا خون تھا اسی لیے رے، فرانک کے لیے اتنا ہی عزیز تھا جتنا کہ پیٹر ہے۔ گلڈا کے لیے یہ بڑی تسلی تھی۔ چند مہینے گزارنے کے بعد فرانک نے گلڈا کو یہ صلاح دی کہ وہ بچوں کی نگرانی کرنے کا کورس کرلے تب فرانک ایک سینٹر کھولے گا، اس سینٹر میں گلڈا نہ صرف رے کی نگہداشت کرے گی بلکہ کچھ دوسرے بچے بھی اس سینٹر میں آجائیں گے اور آمدنی کا ایک سلسلہ بن جائے گا۔

گلڈا جب اپارٹمنٹ سے باہر رے کو لانے کے لیے چلی گئی تو فرانک نے فون کی

گفتگو کو ختم کر دیا۔ چونگا واپس رکھ دینے کے بعد وہ خود بھی کھڑکی کے نزدیک گیا تاکہ اس بات کا پتہ لگائے کہ گلڈا کی پریشانی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے اور وہ کیوں اتنی سہم سمٹ کر کھڑکی میں سے سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سڑک پر ہمیشہ کی طرح گاڑیوں کی آمد و رفت تھی۔ کوئی کار سڑک کے کنارے پر پارک نہیں تھی۔ فٹ پاتھ پر کوئی آدمی نہیں تھا۔ البتہ سامنے کے بس اسٹاپ کے شیڈ میں ایک دبلا پتلا سا لڑکا معمولی کپڑوں میں ملبوس بس کا انتظار کرتا ہوا نظر آیا۔ اس کی شخصیت اور وجاہت میں فرانک کو کوئی کشش نظر نہیں آئی۔ لیکن جب بس آکر چلی گئی اور لڑکا وہیں کھڑا رہا، بار بار اس کی نظریں اٹھیں اور وہ سامنے کی عمارت کی تمام کھڑکیوں کا جائزہ لیتا ہوا دکھائی دیا تو فرانک کو اپنی ہی دال میں کچھ کالا نظر آنے لگا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ ضرور کوئی غنڈہ ہے جو گلڈا کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گلڈا اس قدر سہمے ہوئے تیور کے ساتھ گھر آئی۔ اگر یہ غنڈہ ہونے کی بجائے کوئی شناسا یا دوست ہوتا تو ضرور گلڈا کے ساتھ اپارٹمنٹ میں داخل ہوا ہوتا۔ تب ہال میں سب بیٹھے ہوئے کسی ڈرنک، چائے یا کافی کی چسکیاں لے رہے ہوتے۔

گلڈا، رے کو لے کر واپس آ گئی۔ رے کو کھلونے دیلے۔ رے کی چیزیں قرینے سے رکھیں اور اس کے بعد کچن میں سے شام کے کھانے کے لوازمات ٹیبل پر جمانے لگی۔ اپنے اس کام کے دوران وہ کسی نہ کسی بہانے کھڑکی کے قریب بھی آ جاتی اور جھانک کر نیچے بس اسٹاپ پر دیکھ لیتی۔ فرانک انجان بن کر گلڈا کی حرکتوں کا مشاہدہ کر رہا تھا اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ لڑکا وہیں بس اسٹاپ پر کھڑا عمارت کی کھڑکیوں کی طرف مسلسل طائرانہ نظریں دوڑاتے ہوئے اپنی تلاش میں مصروف ہے۔

پھر جب کھانا لگا دیا گیا تو فارک سے بھنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کو اپنے منہ میں لیتے ہوئے فرانک نے پوچھا۔ "آج کی کوئی غیر معمولی بات؟"

"کوئی نہیں ــــ ساری باتیں حسب معمول۔"

تھوڑی دیر کے بعد کرید نے کی خاطر فرانک نے دوبارہ پوچھا۔ "گھر اور کالج کے

درمیان کا فاصلہ یوں اکیلی طے کرتے ہوئے تمہیں بور تو لگتا ہوگا؟"

گلڈا نے جواب دیا۔" اب اس کی بھی عادت ہوگئی ہے۔ اکثر کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے۔ دو چار باتیں کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو راستے کا احساس نہیں ہوتا۔"

"آج بھی کوئی ملا تھا کیا؟" فرانک نے فوراً پوچھا۔

"ہاں کیاتھی ملی تھی۔ مجھ ہی سے ملنے کے لیے آرہی تھی۔ اس نے کہا ہے کہ اس کے ملک سے ایک لڑکا آیا ہوا ہے جو مجسمہ ساز ہے اور اپنے فن پر کچھ ریسرچ کر رہا ہے۔ کیاتھی نے بتایا کہ اس نے مجھے کئی بار دیکھا اور میرے جسم کا پیکر اسے بہت پسند ہے۔ وہ میرا ماڈل بنانے کا خواہش مند ہے۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟" فرانک نے دوبارہ پوچھا۔

"میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اب سوچ رہی ہوں کہ اگر معاوضے کی اچھی رقم مل سکتی ہے تو ہاں کہہ دینے میں کیا ہرج ہے؟"

"تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے گلڈا۔ تم بہت بھولی اور ناتجربہ کار ہو۔" فرانک نے کسی قدر آواز اٹھا کر لیکن متفکرانہ انداز میں کہا۔"

"یہ تم کس طرح کہہ رہے ہو فرانک؟" گلڈا نے پوچھا:

"تم نہیں جانتیں کہ مجسمہ ساز وہی لوگ بنتے ہیں جو عیاش ہوتے ہیں۔" فرانک نے سمجھانا شروع کر دیا۔" کسی شریف لڑکی کے پیکر کی تعریف کر کے اس کے اندر یہ خواہش جگا دیتے ہیں کہ وہ ماڈل بنے۔ جب وہ لڑکی اس خواہش کو لیے ان کے اسٹوڈیو پر پہنچتی ہے تو فن کے نام پر اس کے کپڑے اُتار لیتے ہیں۔ پیکر کا معائنہ کر لینے کے بعد پوز کی تلاش پر ریسرچ کرتے ہیں۔ مناسب پوز بہر حال مل جاتا ہے۔ کام کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ ابتدا کے فوراً بعد مجسمہ ساز محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا موڈ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ گفتگو کرے گا کہ بغیر موڈ کے ایک فنکار اپنے فن پر نکھار نہیں لا سکتا۔ اس کے بعد بڑی حکمت سے وہ ان ترکیبوں کی فہرست دے گا جس سے فن کار موڈ میں آسکتا ہے اور ان ترکیبوں کے حدود دُور دُور تک پھیلے ہوئے

ہوتے ہیں گلڈا۔"

گلڈا ہنسنے لگی اور پوچھنے لگی "کیا تم نے اور پیٹر نے بھی اپنی زندگیوں کی ابتدا مجسمہ سازی سے کی تھی؟"

"نہیں تو" فرانک نے کسی قدر بدمزگی محسوس کی اور بات کے رُخ کو عمدگی سے بدلتے ہوئے بولا۔ "ویسے تمھیں پلیسوں کی اتنی ضرورت بھی کیا ہے جب کہ تمھارے اور ریے کے لیے میرا وجود تمھارے سامنے ہے۔ بچّوں کی نگہداشت کا کورس مکمّل کر لو تب نہ صرف تمھارا اپنا سینٹر ہوگا بلکہ تم پوپ کے معیار سے مطابقت رکھنے والی خاتون ہوگی اور جنّت کے دروازے تمھارے لیے کھلے ہوں گے۔ اس بات میں کتنی طمانیت ہے تم بھی محسوس کرتی ہو نا گلڈا۔"

"میں ابھی اتنی آگے کی باتیں سوچنا نہیں چاہتی فرانک۔ یہ تم ہی کر سکتے ہو۔"

"در اصل اس جلد باز بے وقوف پیٹر میں اور مجھ میں کوئی فرق تو ضرور ہونا چاہیے۔ اس نے تم جیسی خوب صورت اور سلیقہ مند لڑکی کو غلط زاویوں سے دیکھنے کی چھوٹی غلطی کرنے کے بعد ٹھکرا دینے کی جو بڑی غلطی کی ہے اس کا احساس اسے ہونا چاہیے۔ یہ میں تمھیں اپنا کر دے رہا ہوں۔ پونے دو سال سے تم میرے ساتھ ہو۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں نے تمھیں میرے ساتھ آتے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ تھوڑا عرصہ مزید گزر جانے دو تب تم خود بخود میری کامن لا وائف تسلیم کیے جانے کی اہل ہو جاؤ گی۔"

باہر سورج کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ فرانک نے دیکھا کہ وہ لڑکا اب بس اسٹاپ سے ہٹ کر سڑک کی دوسری جانب والی سائیڈ واک پر ٹہل رہا ہے۔ اس کی نگاہیں پہلے ہی کی طرح کھڑکیوں کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اندھیرے کے بڑھنے کی وجہ سے اب وہ واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔

گلڈا جب ریے کو رات کا کھانا کھلانے کے لیے کمرے میں چلی گئی تو فرانک گیراج کو جانے کے بہانے سے نیچے آیا اور ٹہلتے ہوئے اس لڑکے کے قریب جا کر پوچھا۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

اپنے دونوں ہاتھوں کو پتلون کی جیبوں میں ڈالے ہوئے لڑکے نے فوراً جواب دیا۔ "آپ کا بے انتہا شکریہ! میں اپنی مدد خود ہی کرلوں گا۔ آپ کو زحمت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔"

فرانک کو یہ جواب بہت روکھا لگا۔ وہ جھلاّ کر ٹیلیفون بوتھ کی طرف گیا اور پولیس کو فون کرتے ہوئے بولا۔ "ایک لڑکا شربورن اسٹریٹ کی اونچی بلڈنگ کے سامنے ایک لڑکی کا تعاقب کرنے کا منتظر ہے۔ اس کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔ آپ اس سے بازپرس کریں اور یہاں سے ہٹائیں۔ میں اسے کئی گھنٹوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

پولیس کی کار سڑک پر آئی اور گزر گئی۔

فرانک نے دوبارہ فون کیا۔ "کیوں عمل نہیں کیا گیا؟"

فرانک کو جواب ملا۔ "ہم نے کوئی ایسا مسئلہ اُٹھتے ہوئے نہیں دیکھا جو کہ ایکشن لیے جانے کے قابل ہو۔"

دوسری صبح جب گلڈا باہر جانے کے لیے تیار ہوگئی تب ہی فرانک بھی تیار ہوگیا گلڈا اسائیڈ واک پر سے جا رہی تھی اور فرانک بہت فاصلہ رکھ کر آہستہ آہستہ کار میں جا رہا تھا۔ دو بلاک گزرنے کے بعد ایک بلڈنگ سے وہی لڑکا نکلا اور گلڈا کے پیچھے ہولیا۔ گلڈا کی رفتار تیز ہوگئی۔ تعاقب کرنے والے لڑکے کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ ایک کراسنگ پر سگنل کا انتظار کیے بغیر گلڈا آگے بڑھ گئی اور بائیں جانب سے آنے والی تیز رفتار کار سے بال بال بچ گئی۔ وہ لڑکا بھی پیچھے تھا۔ فرانک نے اپنی کار پارک کی اور تیزی کے ساتھ سائیڈ واک پر چلنے لگا۔ پھر وہ اس لڑکے کے عین پیچھے تھا۔ فرانک نے اس لڑکے کو دبوچ لیا اور نہ صرف بے تحاشہ گھونسے اور لاتیں ماریں بلکہ اس کے ساتھ بوجھل بوجھل گالیوں کی چاشنی بھی تھی۔ لڑکے نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ بس مار کھاتا رہا۔ مدافعت نہ ہونے کی وجہ سے فرانک کے مارنے کی رفتار دھیمی ہوتی گئی۔ تب تک وہ لڑکا بھی بے ہوش ہوکر نیچے گر گیا۔ اس کی ناک اور جبڑوں سے خون نکل رہا تھا۔ آس پاس کے لوگ جمع ہوگئے۔

گلڈا بہت دور سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

فرانک نے کہا" تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ یہ تمہارا پیچھا کر رہا ہے۔"

گلڈا بولی" جو صورتِ حال تم نے پیدا کر دی ہے اس کا مجھے اندیشہ تھا اس لیے تم کو بتانا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں انجان رہوں تو یہ خود ہی میرا پیچھا چھوڑ دے گا۔"

فرانک پولیس کی حراست میں چلا گیا۔ جب اسے جیل کاٹنے کی سزا ہوئی تو وہ پولیس اسٹیشن کی لاری میں بیٹھ کر جیل جانے سے قبل بے بسی سے بولا۔

"میری غیر موجودگی میں گلڈا اور رے کا خیال کون رکھے گا۔"

اسی وقت اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں پٹیاں لپیٹے ہوئے دوسرے کمرے سے وہی لڑکا نمودار ہوا اور بولا۔" میرا نام جم ہے فرانک۔ میں اپنی مدد خود ہی کر لینا چاہتا تھا لیکن تم نے اپنے آہنی ہاتھ پاؤں کے ذریعے سے میری مدد کی اور گلڈا کو مجھ سے بہت قریب کر دیا جس کا بہت شکریہ! اگر تم نے مجھے مارا نہیں ہوتا تو یہ کیسے مجھے دیکھنے اور خیریت پوچھنے کے لیے آئی ہوتی۔ اس سے اچھی طرح باتیں کرنے کا ایسا بہترین موقع نہیں مل سکتا تھا۔"

فرانک نے اسے نفرت سے دیکھا۔ اس سے قبل کہ فرانک جواب دے، سامنے کھڑی ہوئی گلڈا کی طرف بڑھا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ بولا۔" جب تم جیل کاٹ کر باہر آؤ گے تو میں تمہارا ابھی ماڈل بنانے میں خوشی محسوس کروں گا تاکہ نشانی کے طور پر میرے پاس محفوظ رہے۔ اس بات کا وعدہ ہے کہ بناؤں گا ضرور۔"

فرانک کو محسوس ہوا کہ جم نے ایسا کہہ کر بڑی آسانی کے ساتھ اس کے سارے کپڑے اُتار لیے ہیں۔ اب اس کا جسم عریاں ہی نہیں، ایسا شفاف ہو گیا ہے کہ اس کے اندر اور باہر کے تمام ادھورے پن واضح ہو گئے ہیں۔ اسے بڑی شرم سی آنے لگی۔ اپنی شرم کو کم کرنے کی کوشش میں اس نے سوچنا شروع کیا کہ وہ سب لوگ جن کے نام اور چہرے اس کے ذہن میں ہیں کیا وہ بھی ایسے ہی خالی اور ادھورے جسموں میں

اپنے سروں کو اونچا ٹنگائے ایک دوسرے سے ٹکرانے کے ناقص کھیل کھیلنے میں منہمک ہیں۔

دفعتاً پولیس اسٹیشن کے ہال میں رکھے ہوئے ٹی۔ وی کی خبروں کے درمیان پوپ آگئے۔ کنیڈا کے کامیاب دورے کے بعد پوپ واپس جارہے ہیں۔ وہ ایک خاتون کے گالوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے آگے کی طرف جھک رہے ہیں تاکہ اس کا بوسہ لے سکیں۔ فرانک نے سوچا، یہ خلوص ہے، نہیں محبّت ہے، نہیں شفقت ہے، نہیں شفاعت ہے، نہیں عبادت ہے، نہیں دعائیہ ہے، نہیں وداعیہ ہے۔ نہیں نہیں نہیں اور اندھیرا بڑھ گیا۔

ویلنٹائن ڈے

اپنی بو اور کالر کو ٹھیک کرتے ہوئے پچاسی سالہ فریڈ فٹ بال کلب کے گراؤنڈ کے اس بنچ پر سے اُٹھا، جس پر وہ فٹ بال کے مشہور کھلاڑی کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد سے اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ کلب کے تمام اراکین کو پورا علم تھا کہ فریڈ کو فٹ بال کے کھیل سے جنون کی حد تک پیار تھا۔ جب تک اس کے قویٰ تنومند رہے وہ خوب کھیلتا رہا لیکن جب مہ وسال کی روانی میں اس کے جسم کی حکومت کے رگ وپٹھے بغاوت کرنے پر تُل گئے تو فریڈ کو خاموشی کے ساتھ میدان چھوڑ کر میدان کے کنارے والی بنچ کا جمال بن جانا پڑا۔ فریڈ اُٹھا تو اس کے ساتھ شوخ کپڑے زیب تن کیے ہوئے اس کی ستر سالہ بیوی ڈونا بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے بائیں ہاتھ کو فریڈ نے چھاتی اور پیٹ کے درمیان رکھا تو کہنی کی جانب ہاتھ کا حلقہ بنا اور اس حلقے میں ڈونا نے اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ قدم سے قدم ملاتے ہوئے دونوں آہستہ آہستہ اس فٹ پاتھ پر ہو لیے جو اُن کے گھر کی طرف جاتا ہے۔

فریڈ سوچ رہا تھا کہ ڈونا سے اس کی شادی ہوئے اب دوسرا سال ختم ہو رہا ہے سال میں تین بار ڈونا کو مبارکباد دینے، نیک خواہشات کا اظہار کرنے اور اپنی محبت

جتانے کے مواقع آتے ہیں۔ فریڈ ان تینوں موقعوں کو پوری طرح سے استعمال کرتا ہے۔ یہ تین مواقع اس کے سال کے چکر کو تین برابر حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ شادی کی سالگرہ آتی ہے، چار مہینوں کے بعد ڈونا کی پیدائش کا دن آتا ہے اور اس کے چار مہینوں کے بعد سینٹ ویلانٹائن کا دن آتا ہے۔

مذہبی بزرگ ویلانٹائن کے نام سے جو دن پورے امریکہ اور کینیڈا کے تمام شہروں میں تیوہار کی طرح منایا جاتا ہے وہ ایک موقع فراہم کرتا ہے ان لوگوں کو جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی ذریعے سے اپنی محبت کا اظہار کریں۔ تہنیتی کارڈ، تحفے یا اخبار کے کالم عام طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن فریڈ ہمیشہ دوسرے خصوصی طریقوں کا استعمال کر کے بڑا ہی خوش ہوتا اور ڈونا کو بھی خوش کیا کرتا تھا۔

اگلے دن ویلانٹائن ڈے تھا اور فریڈ نے طے کیا تھا کہ اس بار بھی محبت کے اظہار کے لیے وہ نادر طریقہ استعمال کر کے ڈونا کو ایک خوشگوار حیرت دے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈونا کو اس کے نادر طریقے کا علم نہ ہو۔

کلب کے انتظامیہ سے فٹ بال گراؤنڈ کے کنارے نصب کی ہوئی لکڑی کی بڑی بنچ اس نے دو دنوں کے لیے کرائے پر لے لی تھی۔ اس بنچ کا پچھلا حصہ جس کو بیٹھ کا ٹیکا لگا کر بیٹھتے ہیں کافی اونچا اور چوڑا تھا۔ فریڈ نے شہر کے بہترین پینٹر اور آرٹسٹ کی خدمات حاصل کیں۔ طے یہ ہوا کہ رات بھر میں پورے بنچ کو ہلکا گلابی رنگ کر دیا جائے گا کیونکہ ڈونا کو گلابی رنگ پسند تھا۔ ٹیکا لے کر بیٹھنے کے بڑے تختے پر اندر اور باہر کے کناروں پر گلاب کے سرخ پھول، ہرے پتے اور دوسرے نقش و نگار ہوں گے۔ دونوں کونوں میں کیوپڈ کا تیر کھائے ہوئے دل کی تصویر ہوگی۔ اگلے اور پچھلے حصے کی درمیانی جگہ میں لکھا ہوگا "پیاری ڈونا! تم مجھے فٹ بال سے بھی زیادہ عزیز ہو۔ تمھارے بغیر زندگی نامکمل سی لگتی ہے۔"

سیٹوں پر آرام دہ نرم گدوں کی فرمائش تھی اور سامنے کے بورڈ پر ڈونا کے مسکراتے ہوئے چہرے کا خاکہ بننا تھا۔ بورڈ اور بنچ کو قمقموں اور پھولوں سے آراستہ کرنے کی ہدایت دی تھی۔ رات بھر فریڈ کو نیند نہیں آئی۔ اپنے اس انوکھے تحفے کو زیادہ سے زیادہ

پُرکشش بنانے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔

صبح جب کہ ڈونا سو رہی تھی فریڈ باہر چلا گیا اور جب واپس آیا تو وہ بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔

فریڈ کی واپسی تک ڈونا بیدار ہو چکی تھی۔ دونوں نے اپنے مروّجہ طریقے سے محبّت کا اظہار کیا۔ فریڈ نے یاد دلایا کہ ان کی پہلی ملاقات فٹ بال کلب گراؤنڈ کی اس سیٹ پر ہوئی تھی جہاں وہ ہمیشہ بیٹھتا ہوا آیا ہے۔ اب تو وہ بنچ اسی کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سیٹ پر ایک دوسرے کی طبیعت کا اندازہ کر لینے کے بعد انھوں نے محسوس کیا تھا کہ ان کے دلوں کے روشن گوشوں سے وہ کرنیں نکل رہی ہیں جو اپنے اتصال سے روح کو سیراب کر سکتی ہیں۔ پانچ سال کی کورٹ شپ کے بعد انھیں پورا یقین ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے کی ضرورت ہیں اور وہ ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے ان ساری خوشگوار باتوں کو اپنے ذہن میں دہرانے کی خاطر کیوں نہ وہ آج پانچ بجے کے بعد اس بنچ پر جا کر اپنی شام گزاریں اور رات کا کھانا کلب کے ریسٹورنٹ ہی میں کھائیں۔

ڈونا کو یہ تجویز پسند آئی۔ وہ اپنے اپنے کاموں میں پانچ بجے تک مصروف رہے۔

پانچ بجے فریڈ اپنے نئے سوٹ میں ملبوس ڈرائنگ روم میں ڈونا کے آنے کا منتظر تھا۔ ڈونا بھی تیار ہو چکی تھی لیکن ساتھ چلنے سے قبل وہ کسی فون کال کا انتظار کر رہی تھی۔ پانچ بج کر دس منٹ پر فون آیا۔ چند لمحے فون پر بات کرنے کے بعد اس نے زور سے تھینک یو کہا۔

فریڈ نے اپنے ہاتھ کو چھاتی اور پیٹ کے درمیان رکھا۔ ہاتھ کی کہنی کا دائرہ بنا جسے فریڈ نے ڈونا کی جانب ذرا جھکایا۔ ڈونا نے فریڈ کے ہاتھ کے حلقے میں اپنا ہاتھ ڈالا اور دونوں باہر کے دروازے کی طرف جانے لگے۔

گھر سے باہر نکل جانے کے بعد راستے میں فریڈ نے ڈونا سے کہا۔ "غالباً آج کے ڈنر پر تم نے روزن، پینا یا کسی دوسرے دوست کو دعوت دی ہے اور ان کی رضامندی کے فون کا انتظار کر رہی تھیں۔"

"نہیں" ڈونا نے جواب دیا۔ "پوچھ رہے ہو تو بتا ہی دوں گی۔ تم کو سفید رنگ پسند ہے نا! اس لیے میں نے ایک کنٹراکٹر کو فون کر کے ہدایت دی کہ وہ اس بنچ کے تختے کو گھس کر تمام دوسرے رنگ نکال دے اور اس پر عمدہ سفید رنگ چڑھا کر ممکنہ حد تک ڈیکوریٹ کرے۔ سامنے کے بورڈ کو بھی سفید رنگ دے اور اس پر خوبصورتی و دلکشی سے لکھا ہوا ہو، ڈیر فریڈ میں تم سے بے حد محبت کرنے کی وجہ سے ہر اس چیز کو پسند کرنے لگی ہوں جو تم کو پسند ہے، کنٹراکٹر نے فون کر کے مجھے بتایا کہ سارا کام مکمل ہو چکا ہے، رنگ سوکھ گئے ہیں اور بنچ اب بیٹھنے کے قابل ہے۔"

ڈونا نے ذرا سا پلٹ کر پوچھا "خوشی ہو رہی ہے نا تمہیں۔"

فریڈ کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ اسے چکر سی آنے لگی اور غیر ہوتی ہوئی آواز میں اس نے کہا "یہ تم نے کیا کیا ڈونا۔ یہ کیا کیا ڈونا!"

کلب کا گراؤنڈ آ گیا تھا۔ ان دونوں نے دیکھا کہ بڑی خوبصورتی سے آدھی بنچ اور آدھا بورڈ فریڈ کی خواہش کے مطابق ہے اور باقی آدھے آدھے ڈونا کے خیال سے ملتے ہیں۔

کنٹراکٹر نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"مجھے پتہ چل گیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو حیرت انگیز خوشی دینا چاہتے ہیں اس لیے دونوں کی خوشی برقرار رکھتے ہوئے میں نے دونوں کی خواہشوں کا حسین سنگم بنا دیا ہے۔ یہ ترتیب میرا اظہارِ محبت بھی ہے۔ ویلائنٹائن دن کے موقع پر آپ دونوں کے لیے۔"

دل میں خوشی محسوس کرتے ہوئے فریڈ نے سوچا کہ ویلائنٹائن ڈے بھی در اصل فٹ بال کے گیم کا نام ہے جس میں آج وہ ہی حصہ نہیں لے رہا ہے بلکہ ڈونا اور کنٹراکٹر بھی کھیل رہے ہیں۔

دِل ٹوٹنے کا منظر

مشرق سے طلوع ہونے والا سورج مغرب میں غروب ہو جاتا ہے، لیکن یہ بات جو ہو رہی ہے اُس سورج کی ہے جس کی سمتیں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئی تھیں۔ ایسے سورج کا نہ کوئی مشرق ہوتا ہے اور نہ مغرب، اس لیے وہ غروب نہیں ہو سکتا تھا۔ غروب نہ ہونے کے باعث طلوع ہونے کی لطافت سے بھی وہ محروم تھا لیکن جس زمین پر وہ چمک چمک کر اپنی کرنیں برساتا رہا، وہاں کے مکینوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی زمین بنجر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس لیے اس زمین پر بسنے والوں اور اس مٹی کی خوشبو سے نہال ہو کر جھومنے والوں نے اصرار کیا کہ وہ سورج وہاں سے دفع ہو جائے۔ یہ سورج جو ہمارے وطن کی سرزمین کو بنجر بناتا چلا جا رہا ہے، ہمارا سورج نہیں ہو سکتا، کسی دوسری زمین کا سورج ہو گا۔ تب اس کا وجود یہاں پر کیوں ہے؟ وہ ہماری زمین پر سے نکل کر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ ہماری زمین کی پہاڑیوں کو اس کے دیئے ہوئے سنہری سایوں کے پردے نہیں چاہئیں۔ ہمارے دریاؤں پر سے وہ اپنی روپہلی چادر اُٹھا لے۔

سورج نے جب یہ بلند ہوتی ہوئی آواز سُنی تو اضطراب میں آ گیا۔ وہ بے چین

ہو کر بولا کہ وہ سورج ہے۔ سورج اپنی کرنوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی کرنیں روشنی ہی نہیں دیتیں بلکہ ان میں اس کے خلوص کی گرمی بھی ہوتی ہے۔ وہ یہاں سے چلا جائے گا تو انسانوں کی زندگی میں سے وہ تازگی بھی ختم ہو جائے گی جو اس کے خلوص کی دی ہوئی ہے۔ وہ چلا جائے گا تو اندھیرے کا دیو اپنا راج قائم کر لے گا۔ سورج نے یہ بھی راز فاش کیے کہ اس زمین کی وادیوں میں بہت سے سانپ اور بچھو چھپ کر بیٹھے ہیں۔ اگر سورج کی کرنوں کی برچھیاں برسنے سے رک جائیں گی تو ان سب کو باہر آنے کا موقع مل جائے گا اور انسانیت کی لاشوں پر حیوانیت کا ناچ ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ اس سے جانے کے لیے نہ کہا جائے۔

"نہیں نہیں۔" لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ "ہم تمھاری بات نہیں مانیں گے، تم ہم کو نہ ڈراؤ۔ جن مخالف قوتوں کی تم بات کر رہے ہو ہم ان کا ستیاناس کر دیں گے۔ ہمارے اندر مدافعت کی قوّت موجود ہے۔ ہمارے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ ہم سب مل کر ایک نیا سورج بنا سکیں۔ ہمارا بنایا ہوا سورج ہماری زمین کو روشنی کی کرنیں دے گا۔ وہ نہ صرف ہم کو گرمی دے گا بلکہ ہماری دھرتی کی خاک کو زرخیز بنائے گا تاکہ ہماری زمین ہمارے لیے اپنی دولت اُگل سکے۔ ہم اپنی دنیا کو جنّت نشاں بنائیں گے۔ یہ زمین ضرور جنّت نشاں ہوگی۔"

شور ہوتا رہا، بڑھتا رہا۔ "تمھارے دن اب ختم ہو گئے۔ او پرائے سورج! اپنا بوریا بستر باندھ کر اب تم یہاں سے رفوچکر ہو جاؤ۔"

آوازیں اتنی بلند ہوئیں کہ سورج آخر کار ہار گیا۔ اس کی زبان بند ہو گئی اور اس زمین کو چھوڑ کر چلے جانے کے لیے وہ تیّار ہو گیا۔

سورج اداس ہو گیا۔ یہاں اس زمین پر، ان لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے دو سو سال سے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ ان کے اُتار چڑھاؤ سے بڑا لگاؤ ہو گیا تھا۔ ہمدردی کے احساسات کو لے کر سورج سوچنے لگا کہ نیا سورج بنانے کے لیے بہت سے اجزائے ترکیبی کو جمع کرنا پڑتا ہے، انھیں بہت سے آلات کے ذریعے

کاٹنا، توڑنا اور جوڑنا پڑتا ہے۔ مختلف خام اشیاء کی تلاش، انھیں تناسب کے ساتھ ملانا، یہ تمام تصفیے، یہ سارے امور، جانچ پڑتال کے یہ جملہ پیمانے روشنی ہی میں بنتے ہیں۔ نیا سورج وجود میں آنے تک اُجالا تو چاہیے ہی۔ وہ اس زمین سے چلا جائے گا تو اتنا اندھیرا ہو جائے گا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے گا۔ تب نیا سورج بنانے والے کس طرح اپنا کام کر سکیں گے۔ اس لیے اپنا بوریا بستر باندھ لینے کے بعد وہ بولا۔

"میں جا رہا ہوں، لیکن کوئی مجھے بتائے کہ میرے جانے کے بعد اس زمین پر اُجالا کہاں سے آئے گا؟"

بہت دیر تک سکوت رہا۔ اس کے بعد لوگوں کے اژدہام میں سے ایک دُبلا پتلا آدمی نمایاں ہوا۔ اس کے جسم پر کپڑوں کا بوجھ کم تھا، کشمکش میں گزرے ہوئے وقت کا بوجھ سر پر تھا۔ منحنی جسم، پتلی ٹانگیں اور بڑے بڑے کان تھے۔ ایک ہاتھ میں لاٹھی تھی جسے ٹیک کر آہستہ آہستہ وہ سورج کے روبرو آیا۔ دوسرے ہاتھ کی مٹھی اس نے کھولی۔ اس مٹھی میں ایک چھوٹی سی پنھی تھی۔ اس پنھی میں ایک دیا چپکا ہوا تھا۔ اپنا ہاتھ اُٹھا کر پنھی کو سورج کے روبرو کر کے بوڑھا بولا۔

"اُجالوں کے سردار! میرے پاس یہ ایک چھوٹا سا دیا ہے۔ جب آپ یہاں سے چلے جائیں گے تو گھپ اندھیرا ہو جانے کا خطرہ ضرور ہے، مگر تب میں اپنا یہ دیا روشن کروں گا۔ یہ اتنی زیادہ روشنی تو نہیں دے گا جو کہ آپ دے رہے ہیں لیکن میں یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس دیے کی مقدور بھر روشنی گھپ اندھیرے کا سینہ چاک کر سکے گی۔ ہم لوگ آپس میں اپنی شکلیں دیکھ سکیں گے اور نیا سورج بنانے کے لیے ہماری حرکت اور ہماری دوڑ دھوپ آناً فاناً شروع ہو جائے گی۔"

اس کمزور آدمی کے عزم کا اندازہ سورج کو ہو گیا تھا اس لیے مزید کوئی جملہ کہے بغیر وہ اُٹھا اور آہستہ آہستہ مغرب کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ یوں جا رہا تھا جیسے بہت تھکا ہوا ہو۔ ہر قدم پر وہ کمزور ہو رہا تھا۔ وہ بہت دور ہو گیا۔ تب لوگوں نے

دیکھا کہ جیسے وہ مغرب کی جانب رینگ رینگ کر بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ فرش پر گر کر اپنے آپ کو مغرب کی طرف گھسیٹ رہا ہے، پھر وہ غائب ہو گیا۔

گھپ اندھیرا ہو گیا۔ خونخوار حیوانوں کی آوازیں آئیں۔ پہلے ہلکی ہلکی، پھر وہ بلند ہوتی گئیں۔ اندازہ ہو گیا کہ وہ چٹانوں اور پہاڑیوں کے پیچھے سے نکل آتے ہیں۔ ان کے ساتھ رینگنے والے سانپ اور ڈنک مارنے والے بچھو بھی تھے۔ بہت سے انسانوں کا خون ہوا۔ اُمیدیں ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ بوڑھے نے پتھر سے پتھر کو مارا تو چنگاریاں پیدا ہوئیں اور اس کا دیا سُلگ گیا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں حیوانوں کے دل دہلا دینے والے ناچ کے بعد روشنی کی ایک ہلکی سی کرن بھی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ مہیب سائے بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ سانپ اور بچھو روند دیے گئے۔ لوگوں میں ولولے پیدا ہوئے۔ نیا سورج بنانے کی بات شروع ہو گئی۔

پھر اچانک یوں ہوا کہ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ دبی ہوئی آواز میں وہ کہہ رہے تھے کہ یہ بوڑھا جو اپنے ہاتھ میں چراغ تھامے ہوئے ہے، دراصل ہمارا دشمن ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ دوسرے لوگوں نے اس بات کی مخالفت کی۔ دونوں گروہوں میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ آپس میں لڑنے لگے۔ اس لڑائی میں ان کے کپڑے پھٹ کر زمین پر گرے تو پتہ چلا کہ وہ چٹانوں اور پہاڑیوں کے پیچھے رہنے والے حیوان ہیں۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک زہریلی گولی تیر کی طرح آئی اور اس بوڑھے آدمی کے جسم میں گھس گئی جس کے ہاتھ میں دیا تھا۔ وہ آدمی گر گیا جس کے کان بڑے تھے، سر بڑا تھا اور نظریں تیز تھیں۔ اس کے ساتھ اس کے ہاتھ میں تھما ہوا دیا بھی زمین پر گر گیا۔

دیا زمین پر گرا تو لوگ گھبرا گئے۔ اب یہ دیا بجھ جائے گا کہ کیا ہو گا، ہم کیونکر نیا سورج بنائیں گے۔ روشنی کے بغیر اس زمین کو جنت نشان بنانا ممکن نہیں ہے۔ دفعتاً ایک آدمی جو قد آور تھا، جس کے لباس میں گلاب اُگا تھا، تیز ہواؤں کے سامنے آگیا اور گرے ہوئے دیے کو اس نے اُٹھا لیا۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے دیے کے اطراف

اوٹ بنائی۔ مرنے والے کے سرہانے کھڑے ہو کر اس نے لوگوں کو ڈھارس دی۔" اس زمین کو ہم جنت نشاں بنا کر رہیں گے، یہ ہماری زمین ہے، ہماری دنیا ہے، ہم ضرور اپنی دنیا کے لیے نیا سورج بنائیں گے، یہ ہمارا اجتماعی عہد ہے، اس روشنی کے لیے ہمارے بزرگ نے جو دیا جلایا تھا اس کی حفاظت کی میں ذمہ داری لے رہا ہوں۔ میری ذمہ داری میرا وعدہ ہے۔ اس وعدہ کو نبھانے کے لیے میں کئی بار آؤں گا۔ جتنی بار میں گروں گا اتنی ہی بار میں آؤں گا۔ اس وقت تک یہ تسلسل جاری رہے گا جب تک ہم کو ہماری منزل نہ مل جائے۔"

لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک اٹل حقیقت بن کر دیے کو تھامے ہوئے کھڑا ہے۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ اس کے ارادے مضبوط ہیں۔ چٹانوں اور پہاڑیوں کے پیچھے سے خونخوار حیوانوں کی آوازیں آئیں اور دب گئیں۔ مہیب سائے آتے اور جاتے رہے۔ نئے سورج کو وجود میں لانے کے لیے لوگ بڑے انہماک سے کرنیں بنا رہے تھے۔ اپنی دنیا کو جنّت نشاں بنانے کے لیے نقشے تیار ہو رہے تھے۔ وہ قد آور آدمی کھڑا ہوا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ وہ فولاد کا بنا ہوا نہیں تھا کیونکہ اُس کے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ وہ پاؤں کانپنے لگے۔ وہ گرنے لگا۔ لوگ پریشان ہو گئے۔ وہ ڈرنے لگے کہ اب کیا ہوگا۔ ان ہی لمحات میں اس کی بیٹی بازو آگئی وہ بولی۔" میرے پیارے بابا! میرے جسم میں آپ کا خون ہی نہیں بلکہ آپ کا ارادہ، آپ کی لی ہوئی ذمّہ داری اور آپ کا کیا ہوا وعدہ بھی ہے۔ میں آپ کے نقشِ قدم پر کھڑی ہو کر اس دیے کو جلتا ہوا رکھوں گی۔"

سہمے ہوئے لوگوں کی جانب پلٹ کر وہ بولی۔" ہم اس زمین کو جنّت نشاں بنا کر رہیں گے۔ ہم ایک نیا سورج بنا رہے ہیں۔ یہ پروگرام جاری رہے گا۔" لوگ مطمئن ہو گئے۔ وہ اپنے کاموں میں جُٹ گئے۔ پہاڑیوں کی اوٹ میں رہنے والے شیطان تُند ہواؤں کے لپکے روانہ کرتے رہے۔ دیا بھڑکتا تھا، بجھا نہیں۔ خونخوار حیوان کمزوری کا شکار تھے۔ پھر ان میں قوت آئی۔ انھوں نے جشن منایا۔ خوب ناچے۔ دفعتاً ایک مہیب سایہ اس

خاتون پر حاوی ہوگیا اور وہ بھی گر گئی۔
لوگ رونے لگے۔ کیا ہماری قسمت میں منزل نہیں ہے؟ کیا یہ زمین ہمارے لیے ہیرے موتی اگلنے کے قابل نہیں بنے گی؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کب تک ہوتا رہے گا؟ بہت سے لوگوں کے ہونٹوں پر بہت سے سوال تھے۔ انھیں تلاش تھی کسی شخصیت کی جو اِن سوالوں کا جواب دے سکے اور جو اِن کے آنسو خشک کر سکے۔
تب ہی لوگوں نے آسمان پر دیکھا کہ ایک تارا جگ مگ کر رہا ہے۔ وہ دوسرے تاروں سے مختلف ہے کیونکہ وہ حرکت کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔
ایک آدمی نے کہا۔" وہ دائرہ بنا رہا ہے۔ تارا جب ٹوٹتا ہے تو روشنی کی لکیر بناتا ہے۔ اگر وہ دائرہ بنا رہا ہے تو ضرور کوئی دوسری بات ہے۔"
دوسرا آدمی بولا۔" وہ محض تارا نہیں ہے، اسے قطب تارا کہو۔ دیکھو اس کی روشنی دوسرے تاروں کے مقابلے میں کتنی زیادہ ہے۔"
"دیکھو دیکھو روشنی ماند نظر آرہی ہے لیکن دائرہ بڑا ہوتا جا رہا ہے۔"
ایک بزرگ آدمی بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے۔" اگر دائرہ بڑا ہوتا جا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہماری طرف آرہا ہے۔ وہ یہاں اُترے گا۔"
"اگر کوئی قطب تارا ہماری سرزمین کو پسند کرلے تو یہ ہمارے لیے بڑی نیک فال ہوگی۔"

دائرہ زیادہ بڑا ہوتا گیا۔ جب وہ نزدیک آیا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ وہ تارا نہیں بلکہ ایک اُڑن کھٹولہ ہے۔ اس کے اندر ایک شہزادہ بیٹھا ہوا ہے۔ اُڑن کھٹولہ بہت قریب آیا۔ پھر وہ زمین پر آکر رُک گیا۔ اُس کے دروازے کھلے، وہ شہزادہ اُترنے لگا۔ سب کی نگاہیں اس کی جانب مرکوز ہوگئیں۔ لوگوں نے اندازہ لگایا کہ وہ بڑا مضبوط ہے۔ اس کے شاداب اور سنجیدہ چہرے کے نقوش اس کی بلند شخصیت کا پتہ دے رہے تھے۔ اپنے اڑن کھٹولہ سے نیچے اُترنے کے بعد بڑے وقار سے خراماں خراماں چل کر وہ اس جگہ پر گیا جہاں دیا سنبھالنے والی خاتون گری ہوئی تھی۔ زمین پر

گرا ہوا دیا بھڑک رہا تھا، کون جانے کب بجھ جائے۔ نوجوان نے دیے کو اُٹھالیا اور لوگوں کو مخاطب کیا:

"موت کی دی ہوئی بے بسی سے قبل یہ فولادی خاتون ایک جوالامکھی تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ موت نے اسے بے بس نہیں کیا کیونکہ میں اس کا بیٹا اپنی ماں کی جگہ پر کھڑا ہوا ہوں۔"

شہزادے نے ایک پرانی بات یاد دلائی۔ "آپ کو یاد ہوگا کہ یہاں ایک قدآور آدمی تھا جس کے سینے پر پھول اُگتے تھے۔ میں اور میری ماں اس کے کیے ہوئے عہد کی کڑیاں ہیں۔ میری ماں کے بعد اس دیے کی حفاظت اب میں کروں گا۔ تند ہواؤں کے جھونکے اس کو کوئی دھکا دینے سے قبل مجھ سے مقابلہ کریں گے۔ اس زمین کو جنّت نشاں بنانے کی آپ کی کوشش کو روا رکھا جائے گا۔ میں آپ کے سامنے وچن دے رہا ہوں۔"

لوگوں کی اُلجھنیں سُلجھ گئیں۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ ان کے اطمینان نے انھیں خوشی دی کہ ان کے خواب نہیں بکھرے۔ خواب اور حقیقت کے درمیان سیڑھیاں ہوتی ہیں۔ حقیقت کے راستے پر خواب پہلی سیڑھی کا نام ہے۔ ہر اگلی سیڑھی پر خواب کے آمیزے میں حقیقت کا تناسب بڑھ جاتا ہے۔ آخری سیڑھی پر خواب شرمندہ تعبیر ہو کر اٹل حقیقت کے زُمرے میں آجاتا ہے۔ ابھی ان کے خواب کی آخری سیڑھی بہت دور ہے لیکن ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ جب لوگوں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں تو انھیں خود بخود نغمے سُنائی دیتے ہیں۔ ان نغموں نے ان کے چہروں کو شادابی دی۔ شاداب چہروں سے بھی روشنی پھوٹتی ہے اور ایسی روشنی دیے سے نکلنے والے اُجالے سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اس لیے زمین سے ہیرے موتی اُگلوانے کی اسکیم پر کام جاری رہا۔

پہاڑیوں کے پیچھے سے خونخوار حیوانوں کی آوازیں دبتی ابھرتی رہیں۔ جھیب سائے کانا پھوسی کر رہے تھے۔ ان کے ہلکے ہلکے قہقہے بھی سُنائی پڑتے تھے! ہا ہا ہا ہا!

یہ آدمی جسے لوگ شہزادہ کہتے ہیں، ماضی کے اس قد آور آدمی کے عہد کا تسلسل ہے جس کے سینے پر بغیر کانٹوں کے گلاب اُگتے تھے۔ ہم اس شہزادے کو بڑے بڑے کانٹوں والے گلاب سے لہولہان کر دیں گے ہاہاہاہا —— یہ بچّہ اُس خاتون کا خون ہے جو جوالامکھی جیسی لگتی تھی۔ تب ضرور ہم اس شہزادے کو جوالامکھی کے ذریعے سے اڑائیں گے ہاہاہاہا —— خونخوار حیوانوں اور شیطانوں نے مل کر جشن منایا۔ پھر انھوں نے ایک بچھو کو بلایا جس کی ڈنک پر گلاب تھا۔ ایک اُڑنے والے سانپ کا انتخاب ہوا جس کے مُنہ میں زہر کی تھیلی کی بجائے دھماکے کی تھیلی تھی۔ سانپ کے سر پر بچھو بیٹھا، سانپ نے اُڑنے کے لیے پر کھولے حیوانوں اور شیطانوں نے ہنہ قہقہے لگائے ہاہاہاہا اور بولے ون! ٹو! تھری اینڈ گو —— !

جب شیطانوں اور خونخوار حیوانوں کی بھاگ دوڑ کم ہوئی اور قہقہے رُکے تو لوگوں نے بڑی بے چینی کے ساتھ دیکھا کہ ان کا شہزادہ ماضی کی داستان بن چکا ہے۔ انھیں یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی زمین رشیوں مُنیوں کی زمین ہے اور ایسی زمین پر بھوت پریت اور شیطان رہ ہی نہیں سکتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حیوان کتنے ہی خونخوار کیوں نہ ہوں انسانوں پر خواہ مخواہ حملہ نہیں کرتے، خصوصاً ان انسانوں پر کبھی نہیں جو اپنے لیے نیا سورج بنانے کی خاطر سخت مشقت جھیل رہے ہوں۔ اب جبکہ انھیں یقین آگیا کہ شہزادہ مر چکا ہے تو اس یقین کے ہم قدم صدمہ بھی آیا۔ صدمہ اس بات کا کہ الجھنیں، پریشانیاں اور فکرمندیاں جو حیوانوں کے رقص کے باعث ملتی ہیں، ہماری زمین کا حصّہ بن گئی ہیں ہمیں کب ان سے چھٹکارا ملے گا۔ لوگوں کو وہ بلند شخصیت یاد آرہی ہے۔ اس راہبر نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ یہ زمین جنّت نشاں بن جانے تک وہ بار بار آئے گا۔ اس بار وہ کیوں نہیں آیا۔ لوگوں کی نگاہیں راستے پر لگی ہوئی ہیں۔ یہ راستہ کہاں سے شروع ہوتا ہے کسی کو نہیں معلوم، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ یہ راستہ لوگوں کے درمیان میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ راستہ دلوں کو چھوتا ہوا جاتا ہے کیونکہ یہ منزل کو جانے والا راستہ ہے۔

چراغ تلے

بقر عید کا موقعہ تھا۔ لوگ بلند آواز سے ورد کرتے ہوئے میٹروانٹرنیشنل بلڈنگ کے بڑے ہال میں داخل ہونے لگے۔

"اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ سوائے اللہ کے دوسرا کوئی معبود نہیں ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔"

لوگوں کی آمد کا تانتا بندھا تھا۔ خاندان کے خاندان جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ نوجوان اور ضعیف عورت و مرد، چھوٹے بڑے لڑکے لڑکیاں۔ بڑے ہال کی حدود میں آجانے کے بعد مرد اور خواتین الگ الگ ہو رہے تھے۔ خواتین دائیں جانب کے دروازے سے داخل ہو رہی تھیں۔ مرد حضرات اور لڑکے بڑے ہال کے بائیں دروازے میں سے گزر کر ہال میں آگے کی طرف صف آرا ہو رہے تھے۔

موٹر کاروں کے پھیلے ہوئے پارکنگ لاٹ میں نگرانی کرنے والے ایک رضاکار رکن نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے واکی ٹاکی کے نمبرات دبائے۔ دوسری طرف انتظامیہ کے اعزازی رکن نے وہ کال ریسیو کیا اور پوچھا:

"ہلو! ہلو! کیا بات ہے؟"

"جناب! کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اس پارکنگ لاٹ میں کتنی کاریں سمائی جا سکتی ہیں؟"

"چار ہزار کاریں، یقین کے ساتھ۔ لیکن کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"یہ لاٹ بھر گیا ہے جناب لیکن آنے والے کاروں کی لمبی قطار ابھی نظر آ رہی ہے۔ آپ فوراً گیٹ پر کسی والنٹیر کو روانہ کر دیں اور بورڈ لگوا دیں کہ یہ لاٹ فُل ہو گیا ہے۔"

"واہ! واہ!" انتظامیہ کے اس رکن نے دوسرے رکن کو مخاطب کیا۔ "چار ہزار کاروں کی پارکنگ والا وہ احاطہ مکمل ہو گیا ہے۔ یعنی کہ کوئی پندرہ ہزار لوگ جمع ہو چکے ہیں۔"

پارکنگ لاٹ کے رضا کار رکن نے انتظامیہ کے کارکن کو دوبارہ آواز دی۔ "آنے والی کاروں کو پارک کروانے کے لیے کوئی دوسرا انتظام جلد کرنا پڑے گا جناب! ورنہ ٹرافک جام ہو جائے گا اور اسے سلجھانے کے لیے بہت وقت لگے گا۔"

دوسرا رکن پہلے رکن کو جواب دے رہا تھا۔

"اس بار عید ویک اینڈ پر آئی ہے۔ اس لیے وہ لوگ بھی آ گئے جن کو دوسری صورت میں اپنے دفتر یا کام کی جگہ سے چھٹی لینی مشکل ہو گئی ہوتی۔"

"ہاں! آپ کا تجزیہ ٹھیک ہے۔"

نماز کمیٹی کا تیسرا ممبر بولا۔ "یہ بھی مت بھولیے گا کہ اس بار یہاں کے تمام علماء کا اتحاد ہوا ہے۔ اس لیے اپنے اس شہر میں ہماری برادری کے تمام لوگ اکٹھے ہو کر ایک ہی عید منا رہے ہیں۔ ورنہ ان علماء کے اختلاف کی وجہ سے دو عیدیں عموماً اور کبھی کبھی تین عیدیں بھی ہمارے درمیان آتی رہی ہیں۔"

"ایسی عیدیں ہماری خوشیوں کا بھی بٹوارہ کرتی ہیں اور دوسرے گروپ کے لوگوں کے آگے ہمارا مذاق اُڑائے جانے کا ذریعہ بنتی رہی ہیں۔"

"آج کی ہماری کامیابی کا سہرا ہمارے نئے نامزد پیش امام کے سر ہے۔ انھوں نے یہاں ہلال کمیٹی بنائی اور مذہب کے نام پر اونچی آواز نکالنے والے ٹھیکیداروں کو ایک مرکز پر لے آئے۔ اس لیے چاند کے دکھائی دینے یا نہیں دکھائی دینے کا صرف ایک ہی فیصلہ ہوا۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" لوگوں نے حامی بھری۔

لوگوں سے بھرے ہوئے ہال کے اندر، نماز و خطبہ سے قبل پیش امام لوگوں کو مخاطب کر رہے تھے۔ ان کی بھاری بھرکم آواز ہال کے طول و عرض میں گونج رہی تھی۔

"بھائیو اور بہنو! اللہ کا کرم اور احسان ہے کہ نارتھ امریکہ کے اس صوبے میں مسلمانوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارے اس شہر میں پانچ سال قبل صرف ایک جگہ پر جمعہ کا خطبہ اور پانچ وقت کی نمازیں ہوا کرتی تھیں۔ اب ایسی گیارہ جگہیں ہیں۔ رمضان کے مقدّس مہینے میں پہلے صرف تین جگہوں پر تراویح پڑھائی جاتی تھی۔ اس بار کوئی بیس جگہوں پر انتظام ہوا تھا۔ جگہوں کی یہ تعداد اب ہر سال بڑھتی رہے گی۔ پہلے ہمارے لیے حفّاظ باہر سے بلائے جاتے تھے۔ اب انھیں ہم یہاں پر بنا رہے ہیں۔"

مجمع میں سے کسی نے پکارا۔ "نعرۂ تکبیر۔"

تمام لوگوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ "اللہ اکبر۔"

"ہمارے نمازیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔" پیش امام نے شہادت کی انگلی کو اوپر اٹھایا اور بلند آواز میں اپنے بیان کو جاری رکھا۔ "لیکن ہمارے پاس عبادت کے لیے اپنی جگہ نہیں ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اسکول، گرجاؤں اور کمیونٹی سنٹر کے ہالوں کو کرایوں پر لے کر ہم آخر کب تک نمازیں پڑھتے اور پڑھایا کریں گے۔ اس شہر میں ہماری امڈتی ہوئی تعداد کے مدّ نظر ایک نئی بڑی اور عالیشان مسجد کے تعمیر کیے جانے کی ضرورت ہے۔"

"نعرۂ تکبیر۔"

"اللہ اکبر"

"یہ نمایاں عمارت محض مینار و گنبد کی نمائش نہیں پیش کرے گی بلکہ اس کے اندر ایک پائیدار اسلامی مرکز ہوگا۔ یہاں ہم بچوں و بڑوں کو دین کی تعلیم دیں گے۔ اس جگہ سے ایمان کی روشنی پھوٹے گی جو نہ صرف ہمارے چہروں کو بلکہ ہمارے دل و دماغ کو بھی منوّر کر دے گی۔"

پیش امام کی تقریر میں تاثیر کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ مسجد کی تعمیر کے لیے تو زمین خریدی گئی تھی۔ کھدائی اور بنیاد کا پتھر رکھنے کے لیے فنڈ کی ضرورت تھی۔ انھوں نے عطیات کی التجا کرتے ہوئے قرآنی آیتوں کو دُہرایا۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جو کچھ مال و متاع اللہ نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔"

"اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اللہ کو قرض دو۔ تمھارے ایک اصل کے بدلے میں اللہ تمھیں سات سو گنا زیادہ دے گا۔ اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔"

"جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانا بویا جائے اور اس میں سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سَو دانے ہوں۔"

پیش امام کی التجا میں بلا کی مقناطیسیت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مردوں کو ان کے جیب میں ڈالروں کے نوٹ اور بنکوں کے چیک بک بوجھ لگے۔ وہ اپنا بوجھ کم کرنے لگے۔ عید کا موقعہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کے بدن پر زیورات تھے۔ وہ زیورات انھیں چبھ رہے تھے۔ اپنی چبھن کو کم کرنے میں وہ بھی جُٹ گئیں۔ کم عمر لڑکے اور لڑکیوں کے ہاں نہ بوجھ تھا اور نہ چبھن۔ اس لیے انھوں نے اقرار ناموں پر دستخط کیے کہ وہ محلہ محلہ اور گھر گھر جائیں گے اور مسجد کی تعمیر کے لیے رقومات اکٹھی کریں گے۔

اپنی داڑھی میں اپنے ہاتھ سے کنگھی کرتے ہوئے پیش امام نے لقمہ دیا کہ

یہ اللہ کی خوشنودی کا کام ہے۔

رقومات کی گنتی ہونے لگی۔ ایک بڑے بورڈ پر رقومات اور ان کے میزان لکھے جا رہے تھے تاکہ لوگوں کو اطمینان ہو جائے کہ ان کا دیا ہوا عطیہ پہنچ گیا ہے اور اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے جس مقصد کے تحت انھوں نے دیا۔

دس ہزار ڈالر، پچاس ہزار ڈالر اور بڑھتے بڑھتے وہ رقم دو لاکھ سات سو پچاس ڈالر ہو گئی۔ اتنے ہی ہم وزن قیمت کے زیورات عورتوں نے دیئے تھے۔

بیش امام کی لڑکی ٹی۔ وی کے رپورٹر سے کہہ رہی تھی "میرے ڈیڈ اپنی دھن کے پکّے ہیں۔ پہلے وہ اپنی مہم کا مکمل خاکہ بناتے ہیں۔ اس کے تمام پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اپنے عملی اقدامات کو تہہ در تہہ ترتیب دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہی انھیں گہرائی ملتی ہے اور وہ ڈوب کر موتی نکالتے ہیں۔ یہ جو آج اتنی بڑی رقم اکٹھی ہوئی ہے اس کے پیچھے کئی مہینوں کی کوشش اور منظم پلاننگ ہے۔

"آپ لوگ کینڈا کب آئے؟"

"ساڑھے چار، نہیں پونے پانچ بلکہ پانچ سال ہو گئے۔" بیش امام کی لڑکی نے یاد کرتے ہوئے جواب دیا۔ "پہلے ہم لوگ پیرس میں تھے۔ دراصل بابا کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ وہاں پر انھوں نے دین اسلام کے بارے میں تعلیم حاصل کی اور قرآن کو حفظ کیا۔ بہت سے نوجوانوں کو پڑھنے لکھنے کے بعد ملک سے باھر جاتا ہوا دیکھ کر بابا کو بھی خواہش ہوئی کہ وہ بھی باہر جائیں۔ انھوں نے اس خواہش کی دعا مانگی۔ ان کی دعا قبول ہو گئی۔ وہ پیرس چلے گئے۔ پیرس میں انھوں نے میری ماں کے آگے اسلام پیش کیا۔ ماں نے بابا کے نورانی چہرے کو دیکھا اور ان کی پیش کش کو قبول کر لیا۔ دونوں کی شادی ہوئی تو بابا کو فرانس کا امیگریشن تحفے میں ملا۔ اس کے بعد ان لوگوں کی زندگی میں خاص بات یہ ہوئی کہ میں پیدا ہوئی۔"

پیش امام کی بیٹی ہنسنے لگی۔

"آپ کی پیدائش خاص بات ہی ہے۔" ٹی۔وی کے رپورٹر نے کہا۔" ایک فرانسیسی اور ہندوستانی جوڑے کے قائم کیے ہوئے اپنے افق پر ایک چاند نمودار ہوا، جو خوب صورت ہے اور منوّر بھی!"

"شکریہ۔"

"آپ کے ڈیڈ پیرس میں کیا مصروفیت رکھتے تھے؟"

"ایک مسجد کے پیش امام کے طور پر وہ ملازم تھے۔ نمازیں ادا کرنے کے لیے اکثر و بیشتر ان کے پیچھے تین سو کے لگ بھگ لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ میں بہت چھوٹی تھی۔ دیکھا کرتی تھی کہ بابا ہاتھ باندھ رہے ہیں تو سارے لوگ بھی ہاتھ باندھ رہے ہیں۔ بابا گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر جھک رہے ہیں، بیٹھ رہے ہیں اور سجدہ کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر تمام لوگ بھی بڑے ادب کے ساتھ ایسا کر رہے ہیں۔ بابا کی اس قیادت کو دیکھ کر میں خوشی کے مارے بڑی اِترا جاتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ کینڈا کی حکومت کا ایک اعلامیہ نظر سے گزرا جس کے مطابق کینڈا امیگریشن کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ ماں نے بابا کو صلاح دی کہ ہم لوگ اپنی معاشی بہتری کے لیے کینڈا جائیں گے۔ بابا مان گئے۔ ہم لوگ یہاں آگئے۔ مذہب کے کاموں کا رجحان رکھنے والی ایک کمیٹی نے بابا کا انٹرویو لیا اور انھیں ملازمت دے دی۔ بابا نے کمیٹی کے ممبران کو اکسایا تھا کہ وہ ایک مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنائیں۔ ساتھ میں اس بات کی حامی بھی بھری کہ وہ اپنی جانب سے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس منصوبے کو حقیقت کا جامہ پہنائیں گے۔ آج کا یہ موقع اس کی گواہی دے رہا ہے۔"

ٹی۔وی کے رپورٹر نے پیش امام کی بیوی کے آگے مائیک کر دیا اور پوچھا "کیا آپ خوش ہیں کہ آپ نے اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ کینڈا کو اپنا نیا وطن بنایا؟"

"ابتدا میں میں بڑی خوش تھی۔"

"اب کیوں نہیں؟"

"حسد، جلن، تنہائی، دکھ اور غصہ ۔ یہ وہ حصار ہیں جو میرے اطراف کھڑے ہوگئے ہیں اور میں ان کے اندر قید ہو کر رہ گئی ہوں۔"

"کیا آپ بتائیں گی کہ ایسا کیوں ہوا؟"

"میرا شوہر مجھ سے چھوٹ گیا ہے۔ وہ پیش امام جو عوام سے بڑی رقومات بٹور رہے ہیں، میرے رفیق حیات تھے ۔ اب نہیں ہیں۔ اب ان کی شادی مسجد کی مہم کے ساتھ ہوگئی ہے۔ ہر روز فجر کی نماز سے قبل گھر سے نکل جانے کا وقت آجاتا ہے لیکن عشاء کی نماز کے اختتام کے بعد بھی ان کے گھر لوٹ کر آنے کا وقت شروع نہیں ہوتا۔ جب ہم کینیڈا نہیں آئے تھے تب ہر پانچ دنوں کے بعد دو تین دنوں کا ویک اینڈ آیا کرتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں جو ویک اینڈ کے لیے جیا کرتے ہیں۔ صحت مند اور تازہ سانسوں کے انبار میں ہمیشہ ویک اینڈ سے لیتی ہوں۔ اب ہفتہ میں سات دن وہ کام سے لگے رہتے ہیں۔ ویک اینڈ کے نام سے دور بہت دور رہ کر میں مریض بنتی جا رہی ہوں۔ اگر یہ زندگی ہے تو تُف ہے میری ایسی زندگی پر۔"

"ممی" پیش امام کی بیٹی نے مداخلت کی۔ "آپ خوامخواہ اپنے آپ سے اُلجھ رہی ہیں۔ ایک بار اس عبادت گاہ کی دیواروں کو کھڑی ہو جانے دو، آپ کا صبر میٹھے پھل لائے گا۔ بابا پہلے کی طرح اپنے معمول پر آجائیں گے۔ آپ دونوں کی قربانیاں ستائش کے قابل ہو جائیں گی۔ ہماری کمیونٹی کے لوگ آپ کے احسان مند رہیں گے۔ وہ آپ کی قدر کریں گے۔"

"ہنھ" پیش امام کی بیوی نے کہا۔ "مسجد کی تعمیر کے بعد، اسلامک سنٹر، اسلامی کتابوں کی لائبریری کا قیام، اسلامی تعلیم کو پھیلانے کا پروگرام، اسلامی لٹریچر کی ترتیب اور اشاعت کا مسئلہ، حفاظ بنانے کی ضرورت پر غور۔ کتنے ہی ایسے ان گنت

مقاصد، پروجکٹ اور پروگرام ہیں جن کے بکھیڑے ہر روز میرے کان میں پڑتے ہیں۔ مذہب کی یہ مال گاڑی بہت لمبی ہے بیٹی۔ اس کے انجن تمھارے بابا بنے ہوئے ہیں۔ یہ مال گاڑی میرے احساسات کو روندتی ہوئی بڑھ رہی ہے۔ اس کے گھومتے ہوئے پہیے میری خوشیوں میں شگاف ڈال رہے ہیں۔ مال گاڑی کا پہلا ڈبہ گزر گیا اس کا مجھے ہوش ہے لیکن آخری ڈبہ کب گزرے گا اور آخری ڈبے کے گزرنے تک میری کیا حالت ہو جائے گی، مجھے اندازہ نہیں ہے۔ یہ باتیں سوچتی ہوں تو مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔"

آس پاس کے لوگوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ پیش امام کی بیوی کے چہرے پر غصہ، نفرت اور وحشت کے نقوش نظر آرہے ہیں لیکن یہ نقوش مسجد کی تعمیر کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بنے۔ نمایاں گولائی رکھنے والے گنبد نمودار ہوئے۔ ایک اونچا مینار اپنے اعزاز کا ڈنکا پیٹنے لگا۔ گنبد اور مینار دور دور تک نظر آنے لگے۔ کسی قدر فاصلے پر شہر کی خوب صورت عمارتوں کا جمگھٹا تھا۔ ان کی بالائی منزلوں کی کھڑکیوں میں سے بھی گنبد و مینار ایک دوسرے کے ساتھ چہلیں کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

شہر کے وسطی علاقے میں کھڑی ہوئی ایک بلند اور خوب صورت عمارت کی بالائی منزل پر جشن منایا جا رہا تھا۔ جدید فیشن کے ملبوسات تیار کرنے والی کمپنی کی جانب سے شہر کے اور شہر کے اطراف میں رہنے والے تمام معزز لوگوں کو پارٹی میں شرکت کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان میں شامل تجارت پیشہ اور صنعت کار بھی تھے۔ شرکا محفل انواع و اقسام کی شراب سے اپنا دل بہلا رہے تھے ——— خوش گپیوں میں بھی مصروف تھے۔ جو ہوش کھو رہے تھے انھیں فلور پر جا کر رقص کرنے کا ہوش آرہا تھا۔ اس کمپنی کا چیئرمین اس وقت ایک بڑی شخصیت کا حامل بن گیا تھا۔ آنے والا ہر معزز مہمان اسے مبارکباد دے رہا تھا اور اس کی کارکردگی کو سراہ رہا تھا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ فیشن کی دنیا رکھنے والے ممالک کی کمیٹی کی جانب

سے ایک عالمی مقابلۂ حسن کا اعلان ہوا تھا جس میں ماڈلنگ کا کام کرنے والی یا اس کیریر میں آنے کی خواہش مند لڑکیوں کو شریک ہونا تھا۔ فیشن کے ملبوسات بنانے والی اس کمپنی کے چیرمین نے اپنی کمپنی کی طرف سے ایک لڑکی کو اس مقابلے میں بطور ماڈل گرل نامزد کیا تھا۔ وہ لڑکی بڑی غضب کی نکلی۔ درجہ بدرجہ مقابلے جیت کر اپنی اسپانسر کمپنی کے نام کو شہرت کی سیڑھی پر بلند اور بلند تر کرتی چلی گئی۔ وہ سیمی فائینل مقابلوں میں کامیاب ہو کر فائینل میں آئی تو بہت سی نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ اس کے بعد فائینل مقابلہ جیت کر وہ نمبر ون بن گئی۔ کمپنی کا ڈائرکٹر اینڈ چیرمین اپنے دفتر کی کرسی پر سے اُچھلا اور دفتر کے فرش پر خوشی کے مارے رقص کرنے لگا۔ کیونکہ اس کامیابی کے ذریعے اب اس کی کمپنی کا نام دُنیا کی مارکیٹ میں نمایاں ہو جائے گا۔ نمبر ون ماڈل کے ذریعے نمائش کیے ہوئے ملبوسات کے بڑے آرڈر کا ملنا یقینی تھا۔ اگلے برس اس کی کمپنی کو کئی ملین ڈالر کا فائدہ ہوگا ان کا بزنس ہر سال پھیلے گا۔ یورپ اور امریکہ کے اندر بہت جلد ان کی کم از کم سو شاخیں ہوں گی۔ کمپنی کے عہدیداروں نے لائحہ عمل تیار کر لیا تھا۔

ایک نوجوان خوش پوش خاتون نے اپنے ہاتھ سے کمپنی کے صدر نشین کو کھینچا اور دوستانہ بے تکلفی سے بولی۔ "تمھاری وہ عظیم ماڈل گرل کہاں ہے جس کی کامیابی پر تم نے اتنی شاندار اور رنگا رنگ پارٹی کا انتظام کیا ہے۔"

"افسوس ہے کہ وہ نہیں آسکی۔" چیرمین نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم ٹی۔ وی کے بڑے اسکرین پر مقابلوں کے سیمی فائینل اور فائینل کی جھلکیاں دکھائیں گے۔ اس بات کا وعدہ ہے کہ تم اس لڑکی کو ہر زاویے سے دیکھ سکو گی۔ اگر تم اس ویڈیو کیسٹ کی کاپی حاصل کرنا چاہو گی تو میں بڑی خوشی کے ساتھ تمھیں دے سکتا ہوں کیونکہ ہم نے بہت سی کاپیاں بنائی ہیں جو اُن لوگوں کو بطور تحفہ پیش کی جائیں گی جن کے ساتھ کاروباری رابطوں کی توقع ہے۔"

"کیا وہ لڑکی اس شہر میں رہتی ہے؟"

"ہاں اسی شہر میں رہتی ہے۔ آؤ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ کہاں رہتی ہے!"

وہ دونوں بڑی کھڑکی کی جانب گئے۔ کمپنی کے چیرمین نے انگلی سے اشارہ کیا اور بولا "وہ دیکھو وہاں پر ایک مینار اور گنبد ہے۔"

"جانتی ہوں۔ وہ ایک مسلم چرچ ہے۔" خاتون نے جواب دیا۔

چیرمین نے کہا "وہاں کے ہیڈ پریسٹ کی بیٹی ہے۔ اس مسلم چرچ کے قریب ہی ان کا مکان ہے جہاں وہ رہتے ہیں۔"

"تمھیں وہ کیسے مل گئی۔"

"ہمارا شوروم اس لڑکی کے گھر اور اسکول کے درمیان میں پڑتا ہے۔ وہ ہر روز ادھر سے گزرتی تھی اور باہر کے شیشوں میں نگاہیں ڈال کر اندر سجائے ہوئے مختلف ڈیزائن کے لباسوں کو دیکھا کرتی تھی۔ شوروم میں رکھے ہوئے ماڈل مجسموں پر اس کی نظریں ٹھہر جاتی تھیں۔ اس کے اس شوق اور انہماک کو دیکھ کر میں نے ایک دن اسے شوروم کے اندر آنے کی دعوت دی تاکہ وہ قریب سے اپنے پسندیدہ ملبوسات کے ڈیزائین کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ وہ اندر آگئی۔ پھر بلا جھجک اندر آنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کپڑوں کے اسٹانڈ پر سے اپنے پسندیدہ ملبوسات کو اُٹھاتی، اپنے بدن سے لگا کر آئینے میں دیکھتی اور خوش ہوجاتی لیکن اس سوٹ پر قیمت کا لیبل دیکھ کر اداس ہوجاتی تھی۔ لیبل دیکھنے کے بعد وہ اسے دوبارہ جوں کا توں ریک میں سجاتی اور واپس لوٹ جاتی تھی۔ اس کے ساتھ میری دوستانہ گفتگو کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ ایک دن میں نے اسے بتایا کہ مجھے تصویریں کھینچنے کا شوق ہے۔ اس لیے وہ کیوں نہ میرے شوروم کے منتخب کپڑے اپنی پسند کا لحاظ رکھتے ہوئے پہن لے اور اپنے کیمرے سے میں اس کی تصویریں اتاروں گا۔ اس نے مجھے بے اعتباری کے ساتھ دیکھا اور انکار کردیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اُتاری ہوئی تصویریں اور ان کے نگیٹو، دونوں ہی میں اس کو دے دوں گا۔ اپنے ہاں کچھ نہیں رکھوں گا۔ تب وہ راضی ہوگئی۔ میں نے

اس کی تصویریں اُتاریں۔ ہر لباس میں وہ جاذبِ نظر لگتی تھی۔ ہماری کمپنی کے ڈیزائن اس کے جسم پر نکھر جاتے تھے۔ اکثر موقعوں پر میں یہ ملبوسات اسے تحفوں کے طور پر پیش کرنے لگا۔ میں نے اپنی جانب سے اسے صلاح دی کہ وہ فیشن کی دنیا میں آجائے اور اپنے آپ کو ماڈلنگ کے لیے تیار کرے۔ میں نے اس کو بتایا کہ اگر وہ یورپ و امریکہ میں ہونے والا یہ مقابلہ جیت جائے گی تو امریکہ و یورپ کی کوئی بڑی کمپنی بڑی خوشی کے ساتھ ملازمت دے سکتی ہے اور اس کی اُجرت آٹھ یا دس ہزار ڈالر فی ہفتہ ہو سکتی ہے۔ وہ چونکی ضرور تھی لیکن تھوڑی دیر بعد یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس کے ڈیڈ اس کی ایسی ملازمت کو پسند نہیں کریں گے۔ میں نے اس لڑکی کی توجہ اس بات پر دلائی کہ اس کے ڈیڈ نے اپنا آبائی وطن چھوڑ کر اس ملک کو اپنا دوسرا وطن محض ایک اچھے معیار کی زندگی حاصل کرنے کے لیے بنایا ہے۔ ایسا نصب العین رکھنے والے فرد کی بیٹی کو اگر دس ہزار ڈالر ہر ہفتہ کی ملازمت ملے تو زندگی کا معیار ایسا اعلیٰ اور بلند ہو جائے گا کہ جو چند ہی خوش نصیب لوگوں کو ملے۔ اس کے ڈیڈ کو تب اتنی سخت محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ میرے خیال سے اتفاق نہیں رکھتی تھی۔ میں نے آخری تجویز رکھی کہ وہ مقابلے میں شریک ہونے کے لیے آمادہ ہو جائے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ اس مقابلے کی کس منزل پر آکر رُک جاتی ہے۔ ملازمت اور کیریئر کی بات فی الحال ضمنی رہے گی۔ اس نے کہا کہ وہ غور کرے گی۔ وہ چلی گئی۔ چند ہفتوں کے بعد جب وہ دوبارہ آئی تو اس نے مجھے اطلاع دی کہ اس کی ماں اور بابا میں علیحدگی ہو گئی ہے جو بعد میں طلاق کی صورت اختیار کر لے گی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہے اور ماں نے مقابلے میں شرکت کی اجازت دے دی ہے۔"

چیرمین تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ اپنے گلاس کو ہونٹوں سے لگا کر چند گھونٹ لیے اور آگے بولا۔ "اس کے بعد کا نتیجہ تمھارے سامنے ہے۔ جب وہ پہلا نمبر لے کر آئی تو ہم نے سوچا کہ یہ ماڈل کیوں نہ ہماری ہی کمپنی کی ملازمت قبول کرلے۔

یہ تجویز اسے بھی پسند آئی۔ ہم نے پلان بنائے۔ ملازمت کی جگہ پیدا کی اور دس ہزار ڈالر فی ہفتہ معاوضہ پر تین سال کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔"
کھڑکی کے پاس سے وہ واپس آئے اور بھیڑ میں مل گئے۔

ٹی۔ وی کے بڑے اسکرین پر مقابلۂ حسن کی جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں۔ ویڈیو کیسٹ کی کاپیاں لوگوں میں تقسیم بھی کی جا رہی تھیں۔ ایک کاپی گھوم گھام کر ارجن سنگھ کے ہاتھ بھی لگ گئی۔ اپنے دوستوں کے غول میں اس نے وی۔ سی۔ آر کو آن کیا اور تمام نوجوان مقابلۂ حسن کی کارروائی دیکھنے لگے۔
ارجن سنگھ کہہ رہا تھا۔ "اسکول میں یہ ہمارے ساتھ تھی۔ اسکول کو آتی تھی تب اس کا سر ڈھکا ہوا ہوتا تھا۔ سارا جسم ڈھیلے ڈھالے کپڑوں سے لدا ہوا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ لڑکیوں کے درمیان رہتی تھی۔ لڑکوں سے بہت کم بات کرتی تھی۔ دیکھو! نیم عریاں لباس ہو یا بدن پر پھیلے ہوئے فیشن ایبل کپڑے، اس کے انداز ہی الگ ہیں۔ قدم بڑھاتی ہے، ہاتھوں کو جھولاتی ہے تو رگ پٹھوں میں سنہری مچھلیاں ابھرتی ہیں۔ تن کر چلتی ہے تو کبوتری لگتی ہے، پلٹتی ہے تو مورنی کا انداز آجاتا ہے۔ اس کے بدن کے ہر حصّے میں الکٹرانک کی قوت ہے۔ وہ بجلیاں بھی گراتی ہے اور چاندنی کی چادر بھی پھیلاتی ہے۔ اسکول میں جب تھی تو اپنی مسکراہٹ تقسیم کرنے میں بھی بڑی بخیل تھی۔ اب دیکھو کتنی فراخ دلی سے مسکرا رہی ہے۔ ہر ایک کے لیے مسکرا رہی ہے۔ اس کے بال بھی کتنے لمبے اور کیسے غضب کے ہیں۔ ان دنوں تو یہ بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔"
ایک دوست نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا اُس مسجد کے نمازیوں کو علم ہے کہ ان کے پیش امام کی بیٹی دنیا کے اندر ہی جنّت کی حور بن گئی ہے۔"
"علم نہیں ہے" ارجن نے جواب دیا "نمازیوں کی بات چھوڑو۔ جن باتوں کی اطلاع مجھے اور میری ممی کو ہے، وہ باتیں اس کے باپ پیش امام کو بھی نہیں

معلوم ہے۔"

"ارے باپ رے! جب معلوم ہو جائے گا تب کیا ہو گا؟"

"بم پھٹے گا۔ دھماکہ ہو گا۔ بجلی گرے گی۔ لوگ دم بخود ہو جائیں گے۔ ممی بتا رہی تھیں کہ نارتھ امریکہ کا ایک مشہور میگزین ہے جو بڑے آب و تاب سے نکلتا ہے۔ وہ میگزین فیشن کی دنیا سے لگا ہوا ہے۔ اس لڑکی پر وہ ایک خاص شمارہ بہت قریب میں نکالنے والے ہیں۔ اس میگزین کے ٹائیٹل کور پر اور اندر کے ٹکنی کلر صفحات پر بھی نئے زاویوں سے نکالی ہوئی بڑی خاص عریاں تصاویر ہوں گی۔ جب اس خصوصی شمارے کی کاپیاں پھیلیں گی تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا تب بھونچال آئے گا۔ ابھی تو خاموشی ہے۔ سنّاٹا ہے۔"

خاموشی ٹوٹ گئی۔ سنّاٹا ختم ہو گیا۔ بھونچال آ گیا۔

رمضان کے مہینے میں آیا ہوا وہ دن جمعہ کا تھا۔ گڈ فرائی ڈے کی وجہ سے عام تعطیل تھی۔ لوگ بڑی تعداد میں مسجد کو آ رہے تھے۔ مسجد کھچا کھچ بھر گئی۔ بڑے ہال میں جگہ ختم ہو گئی تو لوگ راہداری میں بیٹھ گئے۔ مسجد کے کیفے ٹیریا میں میز کرسی ہٹا کر بیٹھ گئے۔ جو جگہ جسمانی ورزش کرنے کے لیے بنائی گئی تھی وہاں بھی لوگ بیٹھ گئے۔ موذن نے اذان دی۔

"اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ بھلائی کے راستے پر آؤ۔ نمازیں قائم کرو۔ اللہ بہت بڑا ہے۔"

لوگوں کی سنت نمازیں ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھیں۔ درمیان کی ایک صف میں سے پیش امام اُٹھے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے داڑھی اور چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی تمکنت کے ساتھ اگلی صفوں کو چیرتے ہوئے منبر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دفعتاً کسی نے دندناتی آواز میں پیچھے سے پکارا۔

"پیش امام صاحب مہربانی فرما کر ذرا اِدھر آئیے گا۔ اس ہال کے دروازے

کے پاس یہاں راہداری میں، وضو کرنے کی جگہ پر اور کینٹین کی دیوار پر کسی نے نیم عریاں لڑکی کی متعدد تصویریں چپاں کی ہیں۔ اوپر سے لگائے ہوئے سادہ کاغذ سے وہ ڈھکی ہوئی تھیں کسی نے کاغذ نکال دیا تو وہ تصویریں اب سامنے آگئی ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ آپ کی بیٹی کی تصویریں ہیں۔ آپ سے التجا ہے کہ پہلے ادھر آیئے اور اسے پہچانیے!"

نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے مجمع میں بڑی کھلبلی مچ گئی۔ چہ میگوئیاں سکّوں کی طرح گردش کرنے لگیں۔

"پیش امام کی بیٹی کی نیم عریاں تصویریں ایک فیشن میگزین کے حالیہ شمارے میں شائع ہوئی ہیں۔ کسی نے اس شمارے میں سے ان صفحات کو کاٹ کر یہاں چپاں کر دیا ہے۔"

مسجد کے فرش پر بیٹھے ہوئے لوگ نماز کی ادائیگی سے قبل ان تصویروں کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ پیش امام کے اطراف چند والنٹیر آگئے، ہاتھوں کے حلقے میں انھیں گھیرا اور باہر لے آئے۔ سر جھکائے ہوئے، ہاتھوں کو لٹکائے وہ ان تصویروں کے قریب آئے اور کپکپاتی ہوئی آواز میں الفاظ کو چباتے ہوئے بولے۔

"تصویریں میری بیٹی کی ہیں۔"

ڈھلوان پر گرے ہوئے پانی کی طرح پیش امام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ مسجد کے فرش پر پھیلے "پیش امام نے تسلیم کرلیا ہے کہ یہ ان کی بیٹی ہی کی تصویریں ہیں۔ انکار ان سے نہیں بن پڑا۔"

لوگوں کے آپس میں گفتگو کرنے کا شور اٹھا۔ شور بڑھنے لگا۔ پیش امام نے اسی کپکپاتی آواز میں کہا۔

"پہلے میرا خطبہ سن لیجیے گا۔"

شور طوفان بنا۔ "ہم ایسے پیش امام کا نہ خطبہ سنیں گے اور نہ اس کے پیچھے

نماز پڑھیں گے۔"

مسجد کے نظماء نے انتظامیہ کا ہنگامی اجلاس فوراً طلب کیا۔ اس اجلاس میں کسی گفتگو یا مباحثے کی ضرورت نہیں تھی۔ جو رزولیوشن فوری پاس ہو گیا اس کے مطابق پیش امام کو مسجد کی ملازمت سے اسی وقت نکال دیا گیا۔

لاس اینجلز کے سٹی ہال میں منعقد کیا گیا فیشن شو ختم ہوا۔ تب پیش امام کی بیٹی کو اخباروں کے نامہ نگاروں نے گھیر لیا۔ ان کے سوالوں کا جواب دیتی ہوئی وہ کہہ رہی تھی۔

"اس ملک میں ہمارے ملک سے آئے ہوئے لوگوں کی زندگی دو معیار کی ہوتی ہے اور مذہب جز وقتی! عام طور پر لوگ مسجد کو صرف جمعہ کے دن جاتے ہیں یا پھر ہفتہ اتوار میں کسی ایک دن۔ ویک اینڈ میں گھر، مسجد یا ہال کے اندر منعقد کیے ہوئے مذہبی اجتماعات میں عورتیں اور لڑکیاں اپنے بدن کو سر سے پاؤں تک کپڑوں میں چھپاتی ہیں۔ نظریں نیچی رکھنے، کپڑوں پر خوشبو نہیں لگانے کی ہدایات ملتی ہیں۔ خواتین اور مرد الگ بیٹھتے ہیں۔ ان کا آپس میں مل کر بیٹھنا اور آپس میں خوش اخلاقی کے دائرے میں ہنسی کے دو چار بول اکثر قابلِ اعتراض بن جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی خواتین ہفتے کے پانچ دن دفتروں میں کام کرتی ہیں کیونکہ تنخواہ میں ملے ہوئے چیک گھر کے اخراجات کے لیے لانے کی ذمہ داری ان پر بھی لادی گئی ہے۔ وہ وہاں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں، آنکھ سے آنکھ ملا کر گفتگو کرتی ہیں، اپنی حق تلفی ہوتی ہے تو عہدیداروں سے بحث کرتی ہیں۔ ان لڑکیوں میں اور مجھ میں کیا فرق ہے؟ مجھے الزام دے کر میری وجہ سے میرے بابا کی ملازمت کو ختم کر دینا بڑی نا انصافی ہے۔"

دوسرے نامہ نگار کو جواب دیتی ہوئی وہ بولی۔

"میں جانتی ہوں کہ میرے بابا اس وقت مجھ سے خوش نہیں ہیں لیکن

ان کے دل کے کسی گوشے میں یہ خوشی ضرور پوشیدہ ہوگی کہ میں ان کی بیٹی دنیا بھر کے مقابلہ حُسن میں پہلے نمبر پر آئی ہوں۔ اپنے دل کے اندر انھیں یہ ناز بھی ہوگا کہ میں ایک ہفتہ کے اندر جتنے ڈالر کما لیتی ہوں، اتنا ہمارے ملک کا ایک اوسط آدمی پانچ سالوں میں بھی نہیں کما سکتا۔ مسجد کی انتظامیہ کمیٹی نے میرے بابا کو نکال کر خود اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ مسجد کا ڈھانچہ ضرور کھڑا ہو گیا ہے لیکن اس ڈھانچے کے اندر جو بہت سارے منصوبے عملی جامہ پہننے کا انتظار کر رہے ہیں وہ اب اَدھ موئے بن کر پڑے ہوئے ہیں کیونکہ میرے بابا ان منصوبوں کی جان تھے۔ میں چند دنوں کے اندر مسجد کے ٹرسٹیوں کو سو ہزار ڈالر کا چیک بطور عطیہ روانہ کر دوں گی تاکہ انھیں احساس ہو کہ انھوں نے کیا کھویا اور ہم نے کیا پایا ہے۔"

ایک سوال کے جواب میں وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میرا اسڈول جسم اور میری خوبصورتی قدرت کے عطا کیے ہوئے گراں قدر تحفے ہیں۔ ہماری کمیونٹی کے لوگ شوشے دیتے رہتے ہیں کہ میں اپنی خوبصورتی اور متناسب جسم کی نمائش کر کے ہر سال کئی سو ہزار ڈالر کا ذاتی فائدہ اٹھا لیتی ہوں۔ ہمارے لوگ اپنی گفتگو میں یہ ذکر نہیں کرتے کہ میں اپنے اس نئے ملک کی معاشیات کو ترقی دینے کا بھی ایک کل پرزہ بن گئی ہوں۔ مجھے ملازمت دینے والی کمپنی مجھ سے بڑی مطمئن ہے کیونکہ میری اچھی کارکردگی کے باعث ان کا کاروبار خوب پھیل رہا ہے۔ گزشتہ سال ان کا منافع کئی گنا زیادہ بڑھ گیا ہے فیشن کی صنعت میں سلائی کے کارخانے بڑی تعداد میں کُھل گئے ہیں۔ انتظامیہ اور فروختگی کی ایجنسیوں میں کئی سو لوگوں کو روزگار ملا۔ روزگار پانے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو نمازیں پڑھنے کے لیے مسجد جاتے ہیں اور جب سجدوں سے فارغ ہو جاتے ہیں تو دوسرے لوگوں سے مل کر میرے حوالے سے میرے بابا کو بدنام کرتے ہیں۔"

ایک سوال کے جواب میں وہ زور سے ہنسی اور بولی۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔ جب میرے بابا پیش امام تھے تب ہر روز ایک یا دو نمازوں کے بعد لوگوں سے ملنے اور ان کے مسائل پر ان کی رہنمائی کرنے کے لیے وقت نکالتے تھے۔ ان سے ملنے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے آپ پر غیر ضروری اور غیر حقیقی معذوری طاری کر کے وظیفۂ معذوری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، فرضی کار حادثوں کی اساس پر انشورنس کمپنیوں سے بڑی رقم اکٹھی کرتے ہیں، اپنی آمدنی کو اصل آمدنی سے کم بتا کر حکومت کی جانب سے کم آمدنی کے لیے بنائے ہوئے گھروں پر قبضہ کر لیتے ہیں، اپنے آپ کو بے روزگار کہہ کر بے روزگاری کا الاؤنس لیتے ہیں اور پوشیدہ طور پر کام بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب مسجدوں میں چندہ دینے کے لیے آتے ہیں تو کیا ان کی آمدنی کے جائز ہونے یا نہیں ہونے کا کہیں کوئی سوال اٹھتا ہے؟"

ایسے ہی سوالات لے کر اخباروں کے نامہ نگار پیش امام کے اپارٹمنٹ پر گئے۔ ان کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اپنے گھر میں اب وہ تنہا تھے۔ اپنے ڈرائنگ روم کے فرش پر اجلی چادر بچھائے، تکیے کا سہارا لیے وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ ان سوالوں کے جواب میں وہ بولنے لگے۔

"ہم لوگ اس ملک میں زیادہ تر اپنی معاشی حالت کی بہتری اور اپنی زندگی کے معیار کو بلند تر کرنے کے لیے ضرور آئے ہیں۔ ہماری تعداد کم ہے اور ہمارے طور طریقے مختلف ہیں۔ اس لیے اکثر موقعوں پر ہم کو مقامی حالات سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ہر وقت ان معاملات کے ساتھ بھی سمجھوتہ کر لیں جو ہمارے مذہب کے بنیادی اصول پر ضرب لگا رہے ہوں۔ ایسی صورت میں ہمیں کوئی نیا راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ میری بیٹی کی کمائی کا پیسہ مسجد کی تعمیر کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ میں نہیں یقین کروں گا کہ مسجد کی

فنڈ کمیٹی اسے قبول کرے گی۔ اس نے جو راستہ اختیار کر لیا ہے وہ نامناسب ہے۔ میں دوسروں کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ خوشی یا ناز کی کوئی کیفیت میرے دل کے کسی گوشے میں نہیں ہے۔ افسوس ہے مایوسی نہیں، تکلیف ہے لیکن اندھیرا نہیں۔ میں نے اپنے دل کے تمام گوشوں کو ٹٹول کر دیکھ لیا ہے۔ میری بیٹی میری ایک ہی اولاد ہے۔ اس کے اندر میرا خون ہے۔ میں اسے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ میرے منہ سے نکلا ہوا سخت لفظ مجھے ہی کرب دے گا۔ میرے دل میں اس کے لیے محبت کا جذبہ ہے جو اللہ کی دین ہے۔ اسے میں ختم نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ قدرت کی جانب سے جو اختیار مجھے ملا ہے اسے استعمال میں لاتے ہوئے میں نے اسے اچھی تعلیم و تربیت دی ہے۔ اچھی ہدایات سے اسے نوازا ہے۔ میری بیٹی نیک ہے۔ سادہ لوح ہے۔ اچانک اس کی آنکھوں کے آگے نئی دنیا کا اندھیرا آ گیا اور اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے ہیں۔ اسے سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ اندھیرا بہت جلد چھٹ جائے گا۔ میری بیٹی صراط مستقیم کو تلاش کر لے گی۔ صراطِ مستقیم اس کے حاصل کیے جانے والے ڈالروں کی پونجی سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ میرے پاس لوٹ کر آ جائے گی۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔"

اخباروں کے نامہ نگاروں نے نوٹ کیا کہ پیش امام کی آواز بھرا گئی تھی۔

رضاءُ الجبّار —— (سوانحی اشاریہ)

پیدائش : ۱۰ر مارچ ۱۹۳۷ء

بہ مقام : حیدر آباد دکن

ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں ہوئی۔

۱۹۶۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔کام اور ۱۹۶۵ء میں بمبئی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۸۱ء کے اوائل تک حکومتِ ہند کی نگرانی میں بحری جہاز بنانے والی کمپنی میں بطور اکاؤنٹس آفیسر ملازمت کی۔ ساتھ ہی بمبئی کے برہانی کالج آف کامرس میں جز وقتی پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی فرائض بھی انجام دیئے۔

اپریل ۱۹۸۱ء میں امیگریشن حاصل کر کے کینیڈا کے شہر ٹورنٹو منتقل ہو گئے۔ کچھ عرصے وہاں ملازمت کی۔ ادھر تین سال سے اپنی فرم قائم کر لی ہے اور تجارتی اداروں کے حسابات اور ٹیکس کا کام انجام دے رہے ہیں۔

ادبی سفر کی ابتدا ۱۹۵۴ء میں پہلی انعام یافتہ کہانی "لڑکیوں کا وارڈ" سے ہوئی جو مسز کلثوم سایانی کی ادارت میں بمبئی سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ جریدہ "رہبر" میں (جو اُردو اور ہندی میں چھپتا تھا) شائع ہوئی۔ باقاعدہ افسانہ نگاری ۱۹۵۸ء سے شروع کی اور ابتداً ان کے افسانے 'بیسویں صدی' دہلی میں شائع ہوئے۔ تعلیمی سال ۶۰-۱۹۵۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے "مجلۂ عثمانیہ" کی ادارت سنبھالی۔ یونیورسٹی کے چار سالہ دور میں انگریزی، اُردو اور ہندی کے شعبوں سے شائع ہونے والے رسائل میں بہترین کہانیوں اور بین کلیاتی افسانہ نگاری کے مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کیے۔

کینیڈا منتقل ہونے کے بعد رضا الجبار نے انگلستان، اسکاٹ لینڈ، فرانس، امریکہ اور کینیڈا کے متعدد ملکوں کی سیاحت اور کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں مغربی ممالک کی جداگانہ تہذیب کے مشاہدات اور مغرب و مشرق کے ٹکراؤ سے تارکینِ وطن کے اَن گنت مسائل کو موضوع بنا کر کئی کامیاب افسانے تخلیق کیے ہیں۔ وہ ایک دو ماہی دینی، علمی اور تحقیقی مجلہ "ہر سمت" بھی ٹورنٹو سے شائع کرتے ہیں۔ رضا الجبار کی شخصیت اور عزم و حوصلہ اس لیے بھی لائقِ تحسین و توصیف ہے کہ وہ بچپن میں پولیو کے مرض میں مبتلا ہوئے اور ٹانگوں کی قوت چھن گئی۔ لیکن اس حوصلہ مند نوجوان نے ہاتھوں کی توانائی سے پیڈل چلانے والی تین پہیے کی سائیکل سے زندہ رہنے کا عزم کیا اور ڈگریوں پر ڈگریاں حاصل کیں۔ حتیٰ کہ وہ جب موٹر کار چلاتے ہیں تو اپنی سائیکل کو فولڈ کر کے کار میں رکھ لیتے ہیں اور آج ایک کامیاب اور سر بلند چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہی نہیں ——— ایک معروف افسانہ نگار بھی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں زرینہ جبار ایم۔ اے۔ بی ایڈ سے ان کی شادی ہوئی اور ایک بیٹا خالق رضا اور ایک بیٹی شحنہ راجین ان کا سرمایۂ حیات ہیں۔ ان کی حسبِ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

- پہلا افسانوی مجموعہ "روشنی کی کرن" ۱۹۷۱ء۔ صوبائی حکومت مہاراشٹر نے اس کتاب پر اعزاز دیا۔ ہندی ایڈیشن پر حکومتِ ہند سے ادبی انعام ملا۔

- "نئی دھڑکن" (افسانے)۔ اس مجموعے پر آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی نے اعزاز سے نوازا۔
- "نو ہیرے" (بچّوں کے لیے) ۱۹۵۴ء۔
- تالیفات میں "حدیثِ دل" (دکن پر لکھی ہوئی نظمیں) اور "رنگ برنگے پھول" (شمالی امریکہ میں ہند و پاک سے آنے والے شعراء کا انتخاب) یہ دونوں کتابچے کینیڈا سے شائع ہوئے۔ زیرِ اشاعت دو افسانوں کے مجموعے اور ایک ناول۔

موجودہ پتہ : ۳۳۱۱۔ کنگسٹن روڈ۔ اپارٹمنٹ ۹۰۱۔ اسکاربرو کینیڈا۔

— صہبا لکھنوی

"دنیا کے مشہور افسانہ نگار اور ناولسٹ سومرسٹ مام نے میری آٹوگراف بک میں لکھا تھا " ان چیزوں کے بارے میں جن کو تم جانتے ہو اتنی آسان زبان استعمال کرو جتنی تم سے ہو سکتی ہے۔"

رضاء الجبّار صاحب کے افسانے اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ وہ کئی سالوں سے بہت معیاری پرچوں کے لئے لکھتے ہیں۔ انھوں نے جتنے افسانے لکھے ہیں ان کا مواد اپنے ذاتی مشاہدے، مطالعے یا تجربے سے لیا ہے۔ مثال کے طور پر اس کتاب کا پہلا افسانہ سائیکالوجی میں جا سکتا ہے۔ اس میں ان کی اپنی انفرادی مشکلات جھلکتی ہیں اور ان کو کیسے انھوں نے اپنی عظیم ہمّت سے حل کیا ہے۔"

خواجہ احمد عباس

"وقت اور مطالعے نے ان کے بیان میں ایک پختگی پیدا کی ہے۔ "شعور کی زیریں لہر" والوں سے بھی انھوں نے فیض اُٹھایا ہے اور اب جا کر یک رنگی سے ان کا پیچھا چھوٹنے لگا ہے جب وہ اپنے کسی کردار کے دل کی حالت بیان کرتے ہیں تو دبیز رنگ کو باریک موقلم سے گھولنے لگتے ہیں اور یہ پتہ نہیں چلنے دیتے کہ ان میں تجربوں کی خواہش اور کوشش بھی گھلی ہوئی ہے۔"

(ڈاکٹر) ظ۔ انصاری

رضاءُ الجبّار